تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

ناول ساسا میں تہذیبی اختلافات کا مطالعہ

(ہنٹنگٹن کے نظریات کی روشنی میں)

محقق

لیلیٰ ملک

232-FLL/MSURDU/F17

نگران

ڈاکٹر سائرہ بتول

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

TH-26202

MS
809.9335
ل ي ت

تقابلی ادب

ادب اور معاشرہ

جدید ادب - اکیسویں صدی

تہذیبوں کا تصادم (ہنٹنگٹن)

ہنٹنگٹن، سیموئیل پی، 2008-1927 - تنقید و تجزیہ

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ لیلیٰ ملک رجسٹریشن نمبر 232-FLL/MSURDU/F17 نے ایم۔ایس۔اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **" ناول ساسا میں تہذیبی اختلافات کا مطالعہ (ہنٹنگٹن کے نظریات کی روشنی میں)"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر سائرہ بتول

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Laila Malik**

Title of the Thesis: ناول ساسا میں تہذیبی اختلافات کا مطالعہ (ہنٹنگٹن کے نظریات کی روشنی میں)

Registration No: **232-FLL/MSURD/F17**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr. Abdul Aziz Sahir
Professor
Deptt. of Urdu, AIOU,
Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Najeeba Arif
Professor
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد و ثنا اس رب ذوالجلال کی جو واحد لاشریک ہے اور خالق ارض و کائنات بھی درود و سلام اس رحمت العالمین پر جو اس کائنات کی وجہ تخلیق ہیں۔ ایم فل کا کورس ورک مکمل کرنے کے بعد سب سے اہم مرحلہ موضوع کا انتخاب تھا۔ اس سلسلے میں شعبہ کے اساتذہ نے میری رہنمائی کی محترم ڈاکٹر نجیبہ عارف کے کہنے پر نئے آنے والے ناولوں کا مطالعہ کیا جن میں محمد شیراز دستی کا ناول ساسا بھی شامل تھا ناول کو پڑھنے کے بعد احساس ہوا کہ ناول نگار نے ساسا میں نہ صرف نئے موضوع کو متعارف کرایا بلکہ ایک جدید عہد کے حوالے سے پیش آنے والے مسائل پر بھی بحث کی ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک منفرد ناول ہے جس پر تحقیق کرنا ضروری محسوس ہوا۔ لہذا محترمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف کی رہنمائی میں ناول ساسا پر تحقیقی کام کی شروعات کی ۔ مشرق و مغرب کا اختلاف شروع سے ہی موجود رہا ہے اور ادب میں بھی گاہے بگاہے اس کا ذکر مختلف کہانیوں اور ناولوں میں کیا گیا مگر جدید عہد میں یہ اختلاف ایک پیچیدہ صورت اختیار کر چکا ہے ملکوں کا اختلاف تہذیبوں کی سطح پر دیکھا جانے لگا ہے۔ تہذیبوں کے یہی تضادات عہد حاضر کی جنگوں کا سبب بن رہے ہیں۔ ناول ساسا ۲۰۱۸ء میں سامنے آنے والا جدید عہد کا ناول ہے جس میں امریکی تہذیب اور پاکستانی تہذیب کے اختلافات و تضادات کو واضح کیا گیا ہے۔ میرے تحقیقی مقالے کا موضوع "ناول ساسا میں تہذیبی اختلافات کا مطالعہ (ہنٹنگٹن کے نظریات کی روشنی میں)" ہے۔ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے پہلا باب ناول کے تعارف کے ساتھ ساتھ سیموئل پی ہنٹنگٹن کی تھیوری *The Clash of Civilizations* پر مشتمل ہے سیموئل پی ہنٹنگٹن امریکی ماہر سیاست دان اور دور حاضر کے نامور سکالر ہیں ان کا نظریہ *The Clash of Civilizations* ایک منفرد اور مقبول نظریہ ہے جس کو دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے آپ نے *The Clash of Civilizations Remaking of World Order* کے نام سے ۱۹۹۷ء میں اپنے ایک علمی و تحقیقی مضمون کو کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے جس میں سیموئل نے یہ مفروضہ پیش کیا ہے کہ جدید عہد میں جنگیں ممالک کے درمیان نہیں بلکہ تہذیبوں کے مابین ہوں گی۔ تہذیبوں کا اختلاف ثقافتوں کا فرق عہد حاضر میں بنیادی تضادات کی وجہ ہے اور یہی تہذیبوں کا ٹکراؤ اگلی آنے والی جنگوں کا سبب بن سکتا ہے۔ اردو میں تہذیبوں کے تصادم اور

عالمی نظام کی تشکیل نو کے نام سے سہیل انجم نے اس کا ترجمہ کیا جو کہ ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔ دوسرا ترجمہ تہذیبوں کا تصادم: ترجمہ و تلخیص کے نام سے محمد احسن بٹ نے ۲۰۱۹ء میں شائع کیا۔

دوسرے باب میں ناول ساسا میں تہذیبی اختلافات کا مطالعہ کیا گیا ہے تیسرے باب میں تہذیبی اختلافات کو ثقافتی اقدار کے تناظر میں پرکھا گیا ہے جبکہ آخری باب میں سیاسی و مذہبی حوالے سے تہذیبی اختلافات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تحقیقی مقالے کے آخر میں محاصلات پیش کئے گئے ہیں۔

تحقیق کے دوران اگر پیش آنے والی مشکلات کی بات کی جائے تو موضوع کے انتخاب کے وقت میرا خیال تھا کہ اس تحقیق کا دائرہ کار ہنٹنگٹن کی تھیوری اور ناول ساسا ہوگا مگر تحقیقی کام کے لیے مختلف تہذیب و ثقافت کی تصانیف چھاننی پڑیں کئی مضامین اور تحقیقی مقالوں کے صفحے پلٹنے پڑے مگر لاکھ شکر اس ذات پاک کا جو دو جہاں کا مالک ہے اس رب ذالجلال کے کرم سے آج یہ تحقیقی کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ سب سے پہلے میں شکریہ ادا کرتی ہوں اپنے شفیق اساتذہ کرام کا جن کی رہنمائی اور مدد سے میں یہ تحقیقی مقالہ لکھنے میں کامیاب ہوئی۔ ڈاکٹر سائرہ بتول ایک بہترین سپروائزر کی طرح رہنمائی کرتی رہیں اور خاکے کی تیاری سے لے کر مقالے کی تکمیل تک ہر ممکن مدد کی اس کے علاوہ ڈاکٹر حمیرہ اشفاق اور ڈاکٹر نعیمہ بابر کا شکریہ۔ میرے والدین کا شکریہ خاص طور پر میری والدہ کا جو کہ میرے دل کے بہت قریب ہیں اگرچہ میری والدہ میرے ایم فل کے داخلے کے دوران ہی مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کے چلی گئیں مگر میں آج جو کچھ بھی ہوں ان کی دعاؤں کی وجہ سے ہوں۔ میرے بھائیوں کا بہت شکریہ جنہوں نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا خاص طور پر میرے شریک حیات بلال حسین کا بے حد شکریہ جنہوں نے مقالے کی ٹائپنگ اور پرنٹنگ جیسے مشکل مرحلے میں میری مدد کی ہمیشہ ہمدرد اور مہربان دوست کی طرح میرا ساتھ دیا اور حوصلہ افزائی کرتے رہے ۔

لیلیٰ ملک

دسمبر ۲۰۲۰ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اوّل:**	
	ناول کا تعارف اور سیموئل پی، ہنٹنگٹن کا نظریہ (تہذیبوں کا تصادم)	۱
۲۔	**باب دوم:**	
	ناول ساسا میں تہذیبی اختلافات	۳۳
۳۔	**باب سوم:**	
	ناول ساسامیں تہذیبی اختلافات ثقافتی تناظر میں	۵۸
۴۔	**باب چہارم:**	
	ناول ساسامیں تہذیبی اختلافات سیاسی اور مذہبی تناظر میں	۸۳
	ماحصل	۱۱۴
	کتابیات	۱۲۰

بابِ اوّل:

ناول کا تعارف اور سیموئل پی ہنٹنگٹن کا نظریہ (تہذیبوں کا تصادم)

باب اوّل:

ناول کا تعارف اور سیموئل پی، ہنٹنگٹن کا نظریہ

اکیسویں صدی کو اردو ناول کی صدی کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا اس صدی میں اردو زبان کے بے تحاشا ناول منظر عام پر آئے جنہوں نے موضوعات کے تنوع اور تکنیک کے اعتبار سے اردو ناول کا دامن مالا مال کر دیا۔ اس صدی میں اردو کے جو ناول منظر عام پر آئے ان میں مجھے میر کہتے ہیں صاحبو (حبیب حق) پار پرے (جوگندر پال) دھمک ،بکھرے اوراق،شکست کی آواز (عبدالصمد)، غلام باغ ، صفر سے ایک تک ، حسن کی صورت حال ۔ خالی جگہیں پر کرو (مرزا اطہر بیگ) مہاماری،انے دل آوارہ (شموئل احمد) وش منتھن، شوراب،مانجھی (غضنفر) دی وار جرنلس (صلاح الدین پرویز) پلیتہ (پیغام آفاقی) چراغ تہ داماں (اقبال مجید) جنگ جاری ہے،دروازہ بند ہے،ایک بوند اجالا (احمد صغیر) پوکے مان کی دنیا، پروفیسر ایس کی عجیب داستان،آتش رفتہ کے سراغ،نالۂ شب گیر (مشرف عالم ذوقی) بادل ، کابوس (شفق) کئی چاند تھے سر آسماں (شمس الرحمان فاروقی) برف آشنا پرندے (ترنم ریاض) وشواس گھات (جتندر بلو) اندھیرا پگ (ثروت خان) موت کی کتاب (خالد جاوید) نادیدہ بہاروں کے نشاں، صدائے عندلیب بر شاخ شب (شائستہ فاخری) میرے نالوں کی گمشدہ آواز (محمد علیم) نخلستان کی تلاش، ایک ممنوعہ محبت کی کہانی،خدا کے سائے میں آنکھ مچولی (رحمان عباس) ایوانوں کے خوابیدہ چراغ (نورالحسنین) اگنی پریکشا (کشمیری لال ذاکر) کہانی کوئی سناؤ متاشا (صادقہ نواب سحر) اگر تم لوٹ آتے (آچاریہ شوکت خلیل) دھند میں کھوئی ہوئی روشنی (افسانہ خاتون) ایک اور کوسی (نسرین ترنم) دھند میں اُگا پیڑ (آشا پربھات) انجو شوفر (ظفر عدیم) شاہین ،جب گاؤں جاگے (شبر امام) کالی ماٹی (علی امجد) سیاہ کاری ڈور میں ایلین (جاوید حسن) زوال آدم خاکی (غیاث الدین) اور لیمینیٹڈ گرل (اختر آزاد) انو اسی، کرک ناتھ (محمد حفیظ خان) اے عشق بلاخیز، زینہ (خالد فتح محمد)، گل مینہ (زیف سید)، طاؤس فقط رنگ (نیلم احمد بشیر) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں زندگی کے پیچ وخم، شکست وفتح، تخریب وتعمیر، تضاد وتصادم، آویزش و آمیزش، انقلابات وحادثات، ظلم وجور، آہ وفغاں، کساد بازاری، دہشت گردی، جاگیرداری، رسم ورواج وغیرہ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ساتھ ہی ان ناولوں میں ناول نگاروں نے ملکی اصلاح اور حقیقی ترقی کے لیے جدید ٹیکنالوجی کی بات بھی کی ہے۔ تاکہ ملک ہر جگہ ہر محاذ پر ترقی وتعمیر، امن وامان کی صورت میں رہے اور اقوام عالم کا مقابلہ کر سکے۔ اور ان ناولوں میں نوجوان نسل کے جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی مسائل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ کچھ ناول نگاروں نے عصر حاضر میں نوآبادیات کے اثرات کو بھی اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے جیسے مرزا اطہر بیگ کا ناول ہے غــلام بــاغ جس میں پاکستانی معاشرے پر انگریزی تمدن کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔

دور حاضر کے ناول نگاروں نے عصری سیاست، عصری سماجی مسائل کے علاوہ انسان کے درد و کرب کو بھی ناولوں کا خاص موضوع بنایا ہے۔ آج کے ناول نگار نہ صرف روایتی انداز کے مطابق لکھتے بلکہ سماج میں پیدا ہونے والے سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی مسائل کا ذکر بھی اپنے ناولوں میں کرتے ہیں۔ ان ناولوں میں جدید ٹیکنالوجی سے پیدا ہونے والے مسائل سے لے کر ٹیلی ویژن پر ہونے والے رئیلٹی شوز تک پر بات کی گئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس عہد کا ناول نگار کوئی موضوع تشنہ نہیں رہنے دینا چاہتا وہ ہر موضوع کو اپنے ناول میں سمیٹ کر اپنے عہد کی عکاسی کرنا چاہتا ہے۔

اکیسویں صدی کے انہی ناولوں میں ایک اہم ناول محمد شیر از دستی کا ناول ساسا ہے۔ اس صدی میں لکھے جانے والے ناولوں میں ناول ساسا کا موضوع اور بیانیہ دوسرے ناولوں سے منفرد ہے۔ بیانیہ کسی واقعہ کے طریقۂ کار کو بیانیہ کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی بھی صنف میں کسی واقعے کو جزئیات کے ساتھ بیان کرنا اور ایسے بیان کرنا کہ وہ واقعہ کھل کر سامنے آجائے بیانیہ کہلاتا ہے۔ جدید اصطلاح کے طور پر بیانیہ ایسا طریقۂ کار ہے جس کو لسانی اظہار کا طریقہ بناتے ہوئے مصنف اپنے نظریات کو پیش کرتا ہے۔ بیانیہ کا تصور جب ناول میں آتا ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے کہ ناول نگار کن کن الفاظ اور کن کن وسائل کے ذریعے اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔ وہ جس زبان میں اظہار کرتا ہے جو طریقہ اختیار کرتا ہے مثلاً خود کلامی کا، مکالمے کا یا راوی کی حیثیت سے، یہ سب طریقے بیانیہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ناول میں جس طرح تواتر سے واقعات دکھائے جاتے ہیں اور جس ترتیب سے انہیں آگے بڑھایا جاتا ہے وہ ناول کا بیانیہ قائم کرنے میں بہت مدد ومعاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ بیانیہ میں ایک کہانی ہوتی ہے جس کے ارد گرد پھر سارا ماحول تشکیل پاتا ہے کہانی آگے بڑھتی رہتی ہے اور اس کہانی کے ارد گرد پھر پلاٹ، کردار، مکالمہ، مناظر وغیرہ کی خمیر تیار ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں کہانی کے لیے معاون ضرور ہیں لیکن بنیادی اہمیت قصہ کی ہی ہے۔ کہانی کے ساتھ ساتھ یہ چیزیں

بھی چلتی رہتی ہیں اور سب مل کر بیانیہ کی تشکیل کرتے ہیں اس طرح بیانیہ ایک طرح سے ناول نگار کا اظہار یہ بھی ہے یہی بات ناول ساسا کے بیانیہ میں نظر آتی ہے۔ ناول ساسا میں کردار' اظہار کے طریقے اور مناظر کہانی کی مناسبت سے بدلتے رہتے ہیں اسی مناسبت سے کہانی تبدیلی کی منازل طے کرتی جاتی ہے یہاں ناول کے کردار' مناظر نیز اظہار کے طریقے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اگرچہ ناول ساسا سیدھے سادھے بیانیہ میں تحریر کیا گیا ہے۔ لیکن ناول نگار نے اس عہد کے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کرتے اس ناول کا کینوس وسیع کیا ہے جس موضوع سے آج کی امت مسلمہ دوچار ہے اور بطور خاص پاکستان ان حالات سے دوچار ہے جو کہ نائین الیون کے بعد دنیا کو درپیش ہیں۔ اس طرح یہ ناول عہد حاضر میں سماجی مسائل کی عکاسی کرنے والے ناولوں کی فہرست میں شمار ہوتا ہے۔ اس ناول کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مشرقی و مغربی تہذیب کو عمدہ طریقے سے واقعات کے اندر سمیٹ کر پیش کیا گیا ہے۔

ناول ساسا کے مصنف شیر از دستی انگریزی ادبیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی اور پوسٹ ڈاکٹریٹ ہیں اور آج کل بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ یونیورسٹی آف کولوراڈو میں بطور لیکچرار رہ چکے ہیں پاکستان کی دوسری جامعات میں بھی تدریسی خدمات سر انجام دے چکے ہیں آپ کی انگریزی کہانیاں براؤن یونیورسٹی کے جریدے "ویزنز" اور پاکستانی لوک داستانوں کے مختصر انگریزی تراجم یونیورسٹی آف نارتھ ٹیکسس کے جرنل "پاکستانیت" سے شائع ہو چکے ہیں۔

مغل سرائے ۲۰۱۵ء، نسلوں نے سزا پائی ۲۰۱۶ء کے عنوانات سے آپ کی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں جنہوں نے علمی وادبی حلقوں سے خاصی پذیرائی حاصل کی ہے۔

ناول کی کہانی سادہ وضاحتی بیانیہ لیے ہوئے ہے کوئی مبہم عنصر کہانی میں نظر نہیں آتا۔ ناول کی کہانی سلیم نامی شخص کے گرد گھومتی ہے۔ ڈیرہ غازی خان کا رہائشی سلیم محبت کی تلاش میں سات سمندر پار بولڈر شہر میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ بظاہر وہ یہاں کولوراڈو یونیورسٹی میں ایم اے انگریزی کرنے آیا ہے۔ مگر درحقیقت وہ یہاں کسی حسن کی دیوی کی تلاش میں ہے۔

ناول کا آغاز سلیم کے بچپن کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ پرائمری سکول کے ماسٹر نے چوتھی جماعت کے بچوں کو گراونڈ میں جمع کیا اور گاؤں کی چند گم شدہ چیزوں کو ڈھونڈنے کا حکم دیا۔ سامنے موجود ڈبے میں رنگ برنگی پرچیاں تھیں ہر بچے نے پرچی اٹھائی۔ کسی بچے کی پرچی میں نیکی لکھا تھا تو کسی کی پرچی میں سکون، کسی پر غیرت تو کسی پر تمیز، سلیم کے حصے میں جو پڑھی آئی اس پر محبت لکھا تھا۔ دراصل یہی لفظ محبت ناول کا مرکزی تھیم ہے۔

ساسا بنیادی طور پر تلاش محبت کی داستان ہے وہ محبت جو بچپن سے سلیم کے گاؤں میں اس کی منتظر تھی مگر وہ اسے دس ہزار میل دور اپنا اور جینی کے دیس میں تلاش کرتا رہا محبت اور محبوب کا ادرک چاہے بظاہر یہ ایک ہی چیزیں ہیں لیکن عملی معنوں میں ان میں بڑا فرق ہے اگر صرف تلاش محبت ہو تو بھٹکنا واجب نظر آتا ہے اس کی مثال ایک دائرے کی صورت میں لی جا سکتی ہے گر تلاش محبت محبوب کے ادرک کے ساتھ ہو تو معاملہ الگ ہوتا ہے۔ سلیم جو ناول کا بنیادی کردار ہے جس کا مقصد تلاش محبت ہے اور یہ مقصد ایک سر گرمی کی صورت میں اسے حاصل ہوتا ہے جب محبت کے نام کی پرچی اس کے حصے میں آتی ہے اور اسے اس بات کا جواب ڈھونڈ کر لانا ہوتا ہے کہ محبت کہاں ہے۔ یہیں پر ناول کا نسوانی بنیادی کردار منزہ کی صورت میں ہمیں ملتا ہے جس کی سلیم کے ساتھ دوستی ہے سلیم کبھی ہر جائی ہے تو کبھی محبت کا متلاشی گاؤں کے اسکول سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد سلیم کالج اور پھر وہاں سے بڑے شہر اسلام آباد نمل یونیورسٹی میں داخلہ لیتا ہے کہانی کا اصل دھارا یہی سے شروع ہوتا ہے جب وہ کولوراڈو یونیورسٹی سے ایم اے کر رہا ہے اور دی سکائز نامی ہوسٹل میں قیام پذیر ہے اس کے ساتھ اس کے دل میں محبت کی تلاش اب بھی موجود ہے۔ سلیم جب گاؤں کی جانب اسکول سے تلاش محبت میں نکلتا ہے تو اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ گاؤں والوں کی نظر میں یہ نام معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جب گاؤں میں تعلیم بالغان کا آغاز ہوا تھا تو ہیر رانجھا، سسی پنوں کی کہانیوں کو گاؤں کے لوگ بے حیائی کہتے لہذا سلیم کے سوال کرنے پر اسے سرزنش کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب یہی سوال وہ اپنی دوست منزہ کے دادا ابو سے پوچھتا ہے تو وہ اسے کھسہ دے مارتے ہیں۔ واپس سکول پہنچ کر جب ماسٹر جی محبت کے مقام کے بارے میں پوچھتے ہیں تو وہ مقام محبت اپنی دوست منزہ کے دادا کے کھسے میں بتاتا ہے ماسٹر جی سلیم کو دوبارہ تلاش محبت کا بولتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں جب محبت مل جائے تب آ کر مجھے بتائے۔ سلیم کا تصور بن جاتا ہے کہ محبت تو دیار غیر میں ہے جس کا سب سے بڑا محرک کونجیں ہوتی ہیں جو ہر سال سلیم کے گھر کی چھت سے گزرتی تھیں سلیم کونج کی ہجرت اور اسکی محبت سے متاثر ہوتا ہے دراصل یہ واقعہ ہے کہ جب کونجوں پر سلیم کے ابو خالی کارتوس چلاتے ہیں ایک کونج قطار سے الگ ہو کر گر جاتی ہے لیکن کچھ دیر بعد اسکی ساتھی کونج بھی صحن میں اتر آتی ہیں اور الوداعی انداز میں بولتی ہے جس پر سلیم کے ابا کا دل پسیج جاتا ہے اور وہ کونجوں کے جوڑے کو آزاد کر دیتے ہیں اور مسجد میں اعلان کرتے ہیں کہ آئندہ کوئی بھی ان مسافر کونجوں کا شکار نہیں کرے گا۔

دی سکائز ہاسٹل کے ڈائنگ ہال میں سلیم کی دوستی اینا سے ہوتی ہے جو بعد میں محبت جیسے رشتے کی صورت اختیار کر لیتی ہے سیمسٹر بریک پر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنا چاہتے ہیں مگر کچھ عرصے بعد اینا ہندوستانی دوست کے قریب آ جاتی ہے جس کے ساتھ وہ تیراکی کرتی ہے لاشعوری طور پر ہندوستانیوں سے محبت نہ کرنا

اور نفرت کا رویہ اختیار کرنا کسی اور لڑکے سے دوستی کر لینا یہ چیز سلیم کو امریکی حقیقت پسندی کا آئینہ دکھاتی ہے اس کے مطابق محبت تقسیم یا بانٹے جانے کی چیز نہیں ہے۔اہل مشرق محبوب کو ہی کل کائنات سمجھتے اس پر مر مٹتے ہیں خیر یہ دونوں رویے ہر معاشرے میں موجود ہے سلیم بھی کسی اور کی تلاش میں خود کو جاتا محسوس کرتا ہے دوسرا رویہ اختلاف یا دل بھر جانے پر تلاش نو کا آغاز ہے۔ اینا اب بھی کہتی ہے کہ اسے محبت ہے پر سلیم اپنا وقت ناول پڑھ کر یا فلم دیکھ کر گزرتا ہے۔ جینی جسے اس کا دوست چھوڑ چکا ہے۔ دل بہلانے اور نئے ناطے کے لیے ایک طوطا نما پرندہ 'ساسا' لاتی ہے۔ یہ جینی اور سلیم کی قربت کا باعث بنتا ہے۔

ساسا کے بیمار ہونے پر ایمبولینس کے آنے اور جینی کے متفکر ہونے پر سلیم کو تھر میں قحط کی یاد آتی ہے کہ کس طرح تیسری دنیا میں لوگ بھوک سے مر رہے ہیں اور یہاں ایک پرندے کے سست ہونے پر ایمبولینس آجاتی ہے اور اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ یہیں ہمارے وطن میں موجود تمہات اور لوگوں کی سماجی زندگی کا تقابل کیا جاتا ہے ان میں سے ایک روزہ پیر تھے جو ہر مسئلے کے لیے روزہ تجویز کرتے تھے الگ الگ ترکیب کے ساتھ۔ جینی اور سلیم کی قربت بڑھتی ہے اور وہ محبت کے رنگ میں رنگتے چلے جاتے ہیں سلیم اینا اور جینی کا تقابل کرتا ہے اسے جینی میں مشرقیت زیادہ نظر آتی ہے اس کی حیا ساسا کی اوٹ لینا اور جھجکنا سلیم کو مشرق کے مزاج کے مطابق دکھائی دیتا ہے۔

اینا لیش کو ہاسٹل میں لاتی ہے وہیں پر اس کی ملاقات سلیم سے ہوتی ہے یہ کوئی خوشگوار ملاقات نہیں تھی۔ سلیم کو اینا اور لیش پر شدید غصہ آتا ہے اور وہ جینی کی طرف متوجہ ہونا شروع ہوتا ہے۔ جب سلیم جینی کو ساسا کے لیے ساسی کا مشورہ دیتا ہے تو جینی اظہار تشکر کے طور سلیم کو گلے لگا لیتی ہے اینا دیکھ لیتی ہے اور غصے کا اظہار کرتی ہے۔

سلیم نوم چومسکی کے دوست کے سیمینار میں شرکت کرتا ہے جس کا موضوع پاکستان میں امریکہ کے ڈرون حملے ہوتا ہے عام امریکی اپنی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف تھے اور امریکیوں کی پالیسی کے خلاف بولا جارہا تھا سلیم کے سوال کرنے اور پاکستانی ہونے پر گرم جوشی کا اظہار کیا گیا یہیں پر ہمیں ناول کے سیاسی پہلو نظر آتے ہیں اور مصنف کی ورلڈ آرڈر کے حوالے سے رائے کا اظہار ملتا ہے۔ جینی اور سلیم ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔

ناول کی مجموعی صورت حال مشرق و مغرب کے امتیاز کو کہیں واضح کرتی ہے لیکن ہمارے خیال میں اس میں معاصر صورت حال اور گلوبلائزیشن کا عمل دخل زیادہ ہے۔

جینی سلیم کو اپنے والدین کے ساتھ ملواتی ہے والد زندہ دل ہے اور ماں ایک لیزبین ہے جو اب تک اپنی دوستوں کو ڈیٹ کر رہی ہیں جینی ایشیا کی ثقافت کے متعلق پڑھ رہی ہے پاکستانی لباس سے لے کر پاکستانی کھانوں تک دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے سلیم تخیل میں جینی کو اپنی محبت اور پاکستانی کلچر کے مطابق دلہن کا لباس زیب تن کئے

دیکھتا ہے۔ اینا ایش کو اس لیے چھوڑ دیتی ہے کیونکہ وہ چوہے کی پوجا کرتا ہے اینا ایک اور لڑکے میں دلچسپی لینے لگتی ہے لیکن اینا کے ہاں واپسی کی التجا بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن سلیم اسے مسترد کر دیتا ہے کیونکہ وہ جینی کے ساتھ ہمیشہ رہنے کا وعدہ کر چکا ہے۔ یوں ایک محبت کا اختتام ہوتا ہے اور دوسری انتہا کو پہنچتی ہے۔ سلیم جینی کا سگھڑپن دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے اور خود کو معراج محبت پر دیکھتا ہے۔

ناول کی کہانی کے تیسرے رخ کا آغاز تب ہوتا ہے جب اسامہ بن لادن کو پاکستان کے شہر ایبٹ آباد سے پکڑ لیا جاتا ہے یوں اس بات کا مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی پشت پناہی پاکستان ہی کر رہا تھا جس پر سلیم کو سخت رویے کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ایسی نظروں سے دیکھا جاتا ہے کہ جیسے اس سب کا ذمہ دار وہ خود ہے ساتھ ہی ہاسٹل کے سب دوست اس کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں حکومتی سطح کے معاملوں اور ریاستی سطح پر اس کی جواب طلبی ہو رہی تھی سب دوست اور لوگ اس سے خوف کھانے لگ جاتے ہیں لیکن جینی کا رویہ ان سب سے الگ اور محبت بھرا ہوتا ہے۔ سلیم کا تعلق ہاسٹل کے دیگر افراد سے کٹ جاتا ہے جس پر جینی اسے مشورہ دیتی ہے کہ تمہیں لوگوں کا سامنا کرنا چاہیے اس روز سلیم ایک شربت بناتا ہے اور کین میں ڈال کر ان پر نوٹ لگا دیتا ہے

"Saleem makes syrup Tukhm-e-Bilandi a folk drink from Pakistan☺"

لوگ شربت گلاس میں ڈالتے ہیں جب ان کا دھیان کین پر لگے نوٹ کی طرف جاتا ہے تو ایسے خوفزدہ ہو جاتے جیسے یہ کوئی بم ہو یہیں پر سلیم مغربی طریقے سے ذبح کیا ہوا مرغی کا پیس کھاتا ہے جس سے اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے یہیں پر وہ اس بات کے ادراک کو پالیتا ہے کہ وہ ان لوگوں جیسا نہیں ہے۔

اس دوران پاکستان کی حالت ڈرون حملوں کی وجہ سے تشویش ناک ہو جاتی ہے سلیم خود میں دکھ کو محسوس کرتا ہے وہیں علی کے ذریعے اسے علم ہوتا ہے اس کے بچپن کا دوست سادہ ڈرون حملے میں اپنی سانس گنوا بیٹھا ہے۔ سادہ کی موت کے بعد سلیم کی حالت اتنی خراب ہوئی کہ جینی کو ہاسٹل کے اصولوں کے خلاف جا کر سلیم کے کمرے میں شفٹ ہونا پڑا ساسا عدم توجگی کی وجہ سے بیمار ہوا اور علاج کروانے پر بھی صحت یاب نہ ہو سکا اور مر گیا سلیم جب ساسا کے مرنے کی خبر سن کر یونیورسٹی کے لیے نکلتا ہے تو جینی غصہ کرتی ہے کہ یہاں ایک لاش ہے اور وہ یونیورسٹی جا رہا ہے۔ ساسا کی باقاعدہ قبر اور کفن دیکھ کر سلیم کو سادہ یاد آ جاتا ہے کہ اس کو تو کفن کیا جسم کے پورے حصے بھی نصیب نہیں ہوئے سلیم سادہ پکارتا ہے اور روتے روتے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد سلیم کا بہت خیال رکھا جانے لگا۔ اس کے رحم دل ہونے پر سویٹر بنوایا جاتا ہے بولڈر ٹائمز میں اس کی رحم دلی سراہی جاتی ہے اور اس کے چرچے ہوتے ہیں۔ سلیم کے اعزاز میں تقریب منعقد کی جاتی ہے جہاں وہ اپنے پاکستانی ہونے اور دھماکوں کا روز مرہ کا حصہ

ہونے کی وجہ سے خود کو سب سے سخت دل قرار دیتا ہے اور اپنے رونے کی اصل وجہ دو دنیاؤں کا فرق بتاتا ہے۔ جینی اور سلیم وادیٔ خواب کی سیر کو جاتے ہیں سلیم یہ شان دار وادی دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے جینی اس کی تعمیر میں مختلف خداؤں کا ذکر کرتی ہے سلیم کہتا ہے نہیں میرے اور تمہارے مذہب میں صرف ایک خدا ہی ہے جینی سلیم کو غور سے دیکھتی ہے۔ سلیم جینی کو قبول اسلام کا کہتا ہے اور وجہ یہ بتاتا ہے کہ وہ دونوں جنت میں بھی اکھٹے رہ سکیں لیکن دونوں میں دراڑ آجاتی ہے خصوصا جینی الگ زاویے سے سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے بوسٹن میں دھماکے کے بعد جینی فکر مند ہو جاتی ہے اور ڈیو کو فون کرتی ہے اسے ٹروما سے نکالنے کے لیے بوسٹن کی طرف روانہ ہوتی ہے سلیم کا ویزہ اور جینی سے پیار کا تعلق ایک ساتھ ختم ہوتے ہیں جینی سلیم کو جنت میں ملنے کے وعدے کے ساتھ رخصت ہوتی ہے۔

جب سلیم جینی کے ساتھ تاج ہوٹل جاتا ہے وہیں پر وہ ایک مشرقی صورت کو دیکھ لیتا ہے اور اس کے نسوانی حسن پر عش عش کر اٹھتا ہے اسی لڑکی سے سلیم کی ملاقات ائیر پورٹ پر ہو جاتی ہے شکاگو سے ابو ظہبی کے دوران تاج ہوٹل والی لڑکی کی سیٹ سلیم کے ساتھ ہوتی ہے۔ دونوں کا تعارف ہوتا ہے اور فلسفہ محبت پر بحث بھی سلیم اسے سب سچ بتاتا ہے اور منزہ کا ذکر بھی کرتا ہے۔ تاج والی لڑکی اسے منزہ کے نام سے چھیڑتی ہے اور سلیم سے منزہ کی یادیں اور عادتیں پوچھتی ہے ابو ظہبی سے دونوں کے جہاز جدا جدا ہو جاتے ہیں تاج والی لڑکی اپنی ڈائری میں نوٹس لے رہی ہے سلیم کے پوچھنے پر وہ بتاتی ہے کہ ناول کے نوٹس ہیں تاج والی لڑکی سلیم کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ جاتے ہوئے منزہ کے لیے ایک ہیرے کی انگھوٹی لے لے۔

سلیم اسلام آباد پہنچتا ہے تو خاندان کے بیشتر افراد اس کے لیے آئے ہوتے ہیں وہ اپنے کزن علی سے پوچھتا ہے منزہ کے بارے میں علی بتاتا ہے کہ منزہ کے دادا کی دوسری شادی کرنے پر اس کے ابو ناراض ہو کر بچوں سمیت ڈی.جی خان چلے گئے ملاقات کے لیے رشتہ داروں کی آمد شروع ہو جاتی ہے ہر کوئی کہیں نہ کہیں سے سلیم کا رشتہ دار ہونے کا دعوی کرتا ہے اور باتوں ہی باتوں میں خود سلیم کی شادی کی بات چلتی ہے تو مجبوراً سلیم کہتا ہے کہ اسے ایک گوری پسند ہے وہ اس سے شادی کرے گا۔

ماں افسردہ ہو جاتی ہے اور سلیم کو احساس جرم ہونے لگتا ہے کہ اگر وہ اصل میں جینی کو لے آتا یا شادی کر لیتا تو کیا ہوتا؟ سلیم کو پتا چلتا ہے کہ منزہ کی شادی کسی فیض اللہ سے ہونے والی ہے جس کو سب فیضو کہتے ہیں اور یہ رشتہ منزہ کے دادا کی مرضی اور اس کے والد کی مجبوری سے طے پایا ہے سلیم منزہ سے ملنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کی ماں بتاتی ہے یہ کوئی امریکہ نہیں جب دل چاہے مل لیا جائے۔ سلیم گاؤں کے پار ایک کیکر کے سائے میں بیٹھ جاتے ہے۔ جہاں بشکو نائی اور عامر جواب فقیر کے روپ میں ہیں دونوں حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر ملنگ ہو گئے یہ تینوں مل

کر دھمال ڈالنا شروع کر دیتے ہیں ان کو پانی پلایا جاتا ہے سلیم کی حالت غیر ہو جاتی ہے سلیم کو گاؤں کی عورت سے علم ہوتا ہے کہ یہ آب حیات منزہ کی طرف سے آیا وہ بھی دھمال ڈال رہی تھی ہمارے خیال میں یہاں دھمال سے مراد محبت کی شدت ہے۔

سلیم بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے جس پر اس کے ماں باپ بہت پریشان ہوتے ہیں حالت سنبھلنے پر سلیم قبرستان کا رخ کرتا ہے سادے اور ماسٹر جی کی قبر پر حاضری دیتا ہے۔

منزہ کی ماں سلیم کے گھر آتی ہے اور ایک رات ٹھہرنا چاہتی ہے کیونکہ وہ منزہ کے باپ سے جھگڑا کر آئی ہے سلیم کو پتا چلتا ہے کہ یہ تو وہی منزہ ہے جس کے لیے وہ واپس آیا ہے تب اسے پتا چلتا ہے کہ یہ تاج والی لڑکی صرف میرے لیے تاج میں تھی گلے شکوے کے بعد دونوں دل مل جاتے ہیں اور سلیم منزہ کے دادا سے خود بات کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔

سیموئیل پی، ہنٹنگٹن (Samual P. Huntangton):

سیموئیل پی ہنٹنگٹن (Samual P. Huntangton)اپریل ۱۹۲۷ءمیں نیویارک میں پیدا ہوئے اور دسمبر ۲۰۰۸ء میں وفات پائی۔ آپ ایک سائنسدان، سیاست دان اور سکالر تھے۔ ہنٹنگٹن کا اصل میدان پولیٹیکل سائنس ہے۔ انہوں نے نصف صدی سے زائد کا عرصہ ہاورڈ یونیورسٹی میں گزارا۔ وہاں وہ پروفیسر جان ایم اولن انسٹی ٹیوٹ برائے سٹریجٹک سٹڈیز کے ڈائریکٹر بین الاقوامی اور علاقائی مطالعات کے چیرمین، کارٹر انتظامیہ میں نیشنل سیکورٹی کونسل کے لیے ڈائریکٹر برائے سلامتی منصوبہ بندی 'فارن پالیسی' کے بانی اور مدیر اور امریکی پولیٹکل سائنس ایسوسی ایشن کے صدر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔

ان کی وجہ شہرت ۱۹۹۳ء میں پیش کی گئی تھیوری تہذیبوں کا تصادم *(The Clash of Civilizations)* ہے۔

سموئیل پی، ہنٹنگٹن بہت سی کتابوں اور تحقیقی و علمی مضامین کے مصنف ہے۔ان کی چند کتب مندرجہ ذیل ہیں۔

1. *The Clash of Civilizations: Remaking of world Order*(1997)
2. *The Soldier and the State* (1957)
3. *Political Order in Changing Societies* (1968)
4. *The Crisis of Democracy* (1975)
5. *American Politics: The Promise of Disharmony*
6. *Global Dilemmas* (1985)
7. *Culture Matters: How Values Shaper Human Progress* (1997)
8. *The Third Wave: Democratization in the Late Twentieth Century* (1991)
9. *Who are we? The Challenge to American's National Identity* (2004)

۱۹۹۳ء میں، ہنٹنگٹن نے 'فارن افیئرز' کے لیے ایک آرٹیکل لکھا جس کا عنوان تھا "تہذیبوں کا تصادم"

اس مضمون میں ہنٹنگٹن نے ایک مفروضہ قائم کیا کہ لوگوں کی تہذیبی و ثقافتی اور مذہبی شناختیں سرد جنگ کے بعد بنیادی تضاد کی وجہ ہوں گی مزید بحث کرتے ہے اس نے لکھا کہ مستقبل میں جنگیں ملکوں کے درمیان نہیں بلکہ تہذیبوں کے درمیان لڑی جائیں گی اس رسالے کے مدیر کے مطابق جارج کینن کے ۱۹۴۰ء کی دہائی میں تحریر کئے گئے مضمون 'ایکس' کے بعد اس مضمون نے سب سے زیادہ بحث مباحثہ کو جنم دیا ہے۔ مضمون کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے، ہنٹنگٹن نے ۱۹۹۶ء میں اس مضمون کو کتابی صورت میں پیش کیا۔

The Clash of Civilization and the Remaking of World Order کے نام سے جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ اس سال کی سب سے زیادہ بکنے والی کتاب ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے اور جلد ہی یہ دنیا کی بہترین کتابوں میں شمار ہونے لگی۔ اردو زبان میں اس کا ترجمہ محمد احسن بٹ نے تہذیبوں کے تصادم کے نام سے کیا۔

۱۹۹۳ء میں شائع ہونے والے مضمون (جس کا ذکر ہم سیموئل کے تعارف میں کر چکے ہیں) سے ایک نئی بحث کا آغاز ہوا کتاب کے دیباچے میں سیموئل خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کئی لوگ مجھ سے متفق ہوئے کئی لوگ مجھ سے ناراض ہوئے، کئی لوگ خوف زدہ ہوئے اور الجھاؤ کا شکار ہونے لگے۔ دراصل یہ ایک امکانی نوعیت کا مضمون تھا جس طرح ایک مفروضے کی بنیاد ایک امکان پر رکھی جاتی ہے جب اس مضمون کا شور اٹھا اور تفصیل سے لکھا جانے لگا اس مضمون کے مندرجات کو بحث میں لایا گیا تو مضمون کی نوعیت ذرا بدل کر دیکھی گئی جیسے کے مضمون کا عنوان: تہذیبوں کا تصادم؟ ہے لیکن اس سوالیہ نشان پر بہت کم غور کیا گیا اس صورت حال سے ہی سیموئل کے ذہن میں اس موضوع پر تفصیلی اور مدلل انداز میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔

۱۹۹۷ء میں سیموئل کی یہ کتاب شائع ہوتی ہے۔ *The Clash of Civilization and the Remaking of World Order* مضمون نے پہلے سے ہی ایک فضا پیدا کر رکھی تھی اس لیے اس کتاب کے تراجم بھی ہوئے اردو میں بھی اس کتاب کا ترجمہ کیا گیا ہے تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو سہیل انجم نے ترجمہ کی یہ کتاب ۵۷۴ صفحات پر مشتمل ہے یہ اردو ورژن ۲۰۰۳ء میں آکسفورڈ قارئین کے سامنے آیا۔ تہذیبوں کا تصادم محمد احسن بٹ کا ترجمہ ہے جس کو مثال پبلشرز نے شائع کیا یہ کتاب بھی جنوری ۲۰۰۳ء میں سامنے آتی ہے۔ یہ کتاب ۳۸۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ تہذیبوں کا تصادم: ترجمہ و تلخیص (محمد احسن بٹ) اس کتاب کو نگارشات پبلشرز نے ۲۰۱۹ء میں شائع کیا یہ کتاب ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

سیموئل اپنی کتاب کو ۵ حصوں اور ۱۲ ابواب میں تقسیم کرتے ہیں کتاب کے حصے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ تہذیبوں کی دنیا

۲۔ تہذیبوں کا بدلتا ہوا توازن

۳۔ تہذیبوں کا ابھرتا ہوا نظام

۴۔ تہذیبوں کے تصادمات

۵۔ تہذیبوں کا مستقبل

پہلے حصے میں عالمی سیاست کے نئے ادوار۔ تاریخ اور زمانہ حال کے تناظر میں تہذیبیں جدیدت اور مغربیت کو بیان کیا ہے دوسرے حصے میں مغرب کا زوال اور اس کے ممکنات اور معاشیات آبادی اور چیلنج کرنے والی تہذیبیں جیسا کہ مسلم تہذیب کی خصوصیت وہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کے ہاں ایک تصور افزائش نسل کا ہے۔ تیسرے حصے میں سیموئل عالمی سیاست کی نئی تشکیل اور مرکزی ریاستیں چوتھے حصے میں جن کو سیموئل نے تہذیبی تصادمات کا نام دیا ہے اس میں تہذیبی مسائل، تہذیبوں کی عالمی سیاست، عبوری جنگیں اور تقسیمی خط کی جنگیں اور تقسیمی خط کی جنگوں کی حرکیات پر بات کی ہے۔ پانچویں اور آخری حصے میں تہذیبیں اور تہذیب، تہذیبوں کے مستقبل پر بات کی ہے سیموئل کتاب کے دیباچے میں ہی اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ اس کتاب میں عالمی سیاست میں رونما ہونے والے تمام واقعات کو زیر بحث نہیں لایا گیا بلکہ

بین الاقوامی سیاسی ارتقاء کی تقسیم کے لیے ایک بھرپور زاویہ نگاہ پیش کیا گیا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی فلسفہ حتمی ہونے کی سند لے کر نہیں آتا ہے تہذیبی زاویہ نگاہ ۲۰ ویں صدی کے اختتام اور ۲۱ ویں صدی کے آغاز میں عالمی سیاست کے نشیب و فراز کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس زاویہ نگاہ سے ہم گزشتہ صدی کے درمیانی عرصے کے حالات کے اتار چڑھاؤ کو بھی سمجھ سکیں۔

سرد جنگ کے بعد صورت حال میں ایک واضح تبدیلی آنا شروع ہوئی اقوام نے اپنی شناخت کے لیے دوسرے ذرائع استعمال کئے سیموئل کتاب کے آغاز میں اسی بات کا ذکر کرتے ہیں اس کے نزدیک ایک تبدیلی کی بڑی وجہ موجودہ پول سسٹم جو کہ اقوام کی مجموعیت کو ایک تشخص دیتا تھا اس کے ٹوٹنے کے بعد لوگوں نے اپنی پرانی شناختوں کو از سر نو دریافت کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہیں پر ایک انداز سے سیموئل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ لوگ پرانے دشمنوں کی جانب پلٹ رہے ہیں کیونکہ پلٹنا جہاں ایک انفرادی عمل ہے وہیں پر یہ اپنے جامعی تقاضوں کے ساتھ عمل فرما ہوتا ہے۔ سیموئل ایک ناول (مردہ جھیل) سے اقتباس دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> جن کے کوئی اصل دشمن نہیں ہوتے ان کے سچے دوست بھی نہیں ہوتے ہیں۔ ہم اس وقت تک اپنوں سے محبت نہیں کر سکتے جب تک غیروں سے نفرت نہیں کرتے ہیں۔ جو لوگ ان حقیقتوں کو

ٹھکراتے ہیں دراصل وہ اپنے خاندان، اپنے ورثے، اپنی ثقافت، اپنے جنم کے حق اور یہاں تک کہ اپنے
آپ کو بھی ٹھکراتے ہیں اور انہیں کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔[1]

ادب معاشرے کی ایک اہم اکائی ہے تمام عوامل اپنی با تمام و کمال خصوصیات کے ساتھ ادب پر اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں اس لیے ادب کا میدان فوقیت کا حامل ہے تبدیلی چاہے وہ سائنس کے میدان میں آئے یا کسی سیاسی سطح پر ایک ادیب ان عوامل کو شعوری یا غیر شعوری سطح پر دیکھ رہا ہوتا ہے ناول کا مندرجہ ذیل اقتباس بھی اس نفسیاتی سیاق کو واضح کرتا ہوا نظر آتا ہے جو تبدیلی سرد جنگ کے بعد پیدا ہو رہی تھی۔

پہلے ہم اختصار کے ساتھ ان پانچ بنیادی مفروضات کو بیان کر لیتے ہیں جن پر اس نظریے کی بنیاد قائم ہے انسانی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ عالمی سیاست کثیر التہذیبی ہو گئی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ جو جدیدیت آتی ہے وہ مغربیت سے بالکل الگ شے ہے۔ جدیدیت کے بارے میں کوئی واضح تاریخ متعین نہیں کی جا سکتی ہے بلکہ یہ عمل صدیوں پر مشتمل ہے جدیدیت دو صورتوں میں سامنے آتی ہے ایک سیاسی صورت ہے اور دوسری جمالیاتی صورت ہے ایک کا تعلق سیاسی عوامل سے ہے اور دوسری جو جمالیاتی صورت ہے اس کا تعلق ادب سے ہے۔ دوم یہ کہ تہذیبوں کے درمیان طاقت کا توازن بدل رہا ہے مغرب کا اثر ورسوخ کم ہو رہا ہے اس میں اہم عنصر ایشیائی تہذیبوں کا ہے جو اپنی اقتصادی عسکری اور سیاسی طاقتوں کو بڑھا رہی ہیں۔ اسلام کی آبادی میں اضافہ ایک غیر مستحکم صورت حال کو پیدا کر رہا ہے غیر مغربی تہذیبیں اپنے ثقافتی اقدار کو از سر نو اپنا رہی ہیں۔ سوم یہ کہ ایک ایسا تہذیبی نظام تشکیل پا رہا ہے جس کی اساس تہذیبوں پر قائم ہے، جو معاشرے ثقافتی طور پر ایک جیسے ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں ایک تہذیب کے معاشروں کو دوسری تہذیب میں تبدیل کرنے کا عمل ناکامی کا شکار ہو گیا ہے۔ تمام ملک کسی نہ کسی مرکزی ریاست کے گرد متحد ہو رہے ہیں۔ چہارم یہ کہ مغرب ایک تصادم کی حالت میں ہے کیونکہ مغرب کا دعوی آفاقیت کا ہے۔ اس وجہ سے مغرب کا زیادہ سنگین تصادم اسلام اور چین کے ساتھ ہوا ہے ایسی جنگوں نے جو خط تقسیم پر ہو رہی ہیں خصوصاً مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین جنگوں نے اپنے تہذیبی ملکوں کے اوپر اعتماد کے رویے کو مستحکم کر دیا۔ پانچواں مفروضہ یہ کہ مغرب کی بقاء کا انحصار اس بات پر ہے امریکی اپنے مغربی تشخص کو دوبارہ تسلیم کریں مغرب والے اپنی تہذیب کو آفاقی منوانے کی بجائے اسے منفرد تہذیب منوائیں اور غیر مغربی معاشروں کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے آپس میں اتحاد قائم کریں تہذیبوں کی عالمی جنگ سے بچاؤ کا انحصار اس بات پر ہے کہ عالمی رہنما عالمی سیاست کی کثیر التہذیبی نوعیت کو حقیقت مانیں اور اس کے درست انتظام کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کریں۔

تہذیب کا دوسری تہذیب کے ساتھ لین دین اور اس کی علمیات سے استفادہ حاصل کرنا وغیرہ کی گواہی بہت سی تہذیبوں کی زبانی ہمیں سننے کو ملتی ہے۔ مصر کی تہذیب، عرب کی تہذیب، ہڑپہ کی تہذیب۔ ہمارے خطے میں ایک اہم تبدیلی آریاؤں کے آنے سے آتی ہے جدت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آریاؤں سے دراوڑیوں کو اپنا مغلوب بنالیا۔

تہذیبی دنیا کی ارتقائی صورت حال کو سیموئل ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ۔۔۔پھر تقریباً ۱۵۰۰ء میں جدید دور کے شروع ہوتے ہی عالمی سیاست کے دو رخ واضح ہوئے۔ مغرب کے قومی ریاستوں پر برطانیہ، فرانس، سپین، آسٹریا، پرویشا امریکہ وغیرہ نے چار سو سال سے زیادہ مدت تک مغربی تہذیب کے اندر ایک کثیر قطبی بین الاقوامی نظام قائم کیا، اس نظام کے تحت انہوں نے باہمی تعلق استوار کئے ایک دوسرے کا مقابلہ کیا اور آپس میں جنگیں لڑی گئیں۔ اسی دور میں مغربی قوموں نے خود کو دنیا کی ہر تہذیب تک پھیلایا۔۔۔ دنیا تین حصوں میں تقسیم ہوگئی امریکہ کی رہنمائی میں سرمایادار نظام اور جمہوری نظام حکومت رکھنے والے معاشروں کا ایک گروپ دنیا کے دوسرے حصے میں شامل سوویت یونین کی رہنمائی والے نسبتاً غریب کیمونٹ معاشروں کے گروپ سے نظریاتی سیاسی اقتصادی اور کبھی کبھی عسکری مقابلے کر رہا تھا۔۔۔ کچھ ایسے ملک بھی تھے جن کو تیسری دنیا کیا جاتا تھا اور جو اکثر غریب تھے سیاسی حوالے سے غیر مستحکم تھے آزادی سے نئے نئے ہم کنار ہوئے تھے اور غیر جانب داری کا دعوی کرتے تھے۔ [۲]

سیموئل مغرب کو ایک طاقتور تہذیب کہتے ہیں لیکن اس کی طاقت کے انحصار پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مغرب کی طاقت کا انحصار دوسری تہذیبوں کی کمزوری اور زوال پر ہے یہ ایک طرح کا مشورہ بھی ہے شاید یہی وجہ ہے ہمارے ہاں ہر مسئلے کو مغرب سے جوڑا جاتا ہے اور ہر برائی کو اہل مغرب کی سازش کہا جاتا ہے ممکن ہے ان عوامل کی بنیاد پر یہ نظریہ ہمارے ہاں مقبول ہوا ہو۔ جوں جوں مغرب اپنے اقتدار کے فروغ اور اپنے مفادات کے تحفظ کی کوششیں کر رہا ہے ویسے ویسے غیر مغربی معاشرے یا تو مغرب کا مقابلہ کرنے لگے ہیں یا اس کے اتحادی بن رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ سرد جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد نئی عالمی شکل ثقافتی بنیادوں پر متعین ہونے لگی۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا سات سے آٹھ بڑی تہذیبوں میں بدل گئی اس وقت ریاستوں کے مفادات، دشمنوں اور دوستوں کے حوالے سے ثقافتی یکسانیت اور تقادات اہم کردار ادا کر رہے تھے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اہم ممالک کا تعلق بڑی تہذیبوں کے ساتھ ہے سیموئل اس حوالے سے کہتے ہیں کہ اس وقت بین الاقوامی ایجنڈے کا سر فہرست مسئلہ تہذیبوں کے مابین اختلافات اور منتقلی ہے۔ عالمی سیاست کا انداز کثیر قطبی اور کثیر التہذیبی ہے۔

ہم اور وہ کا تصور بہت پرانا ہے یعنی کہ اس بات کی وضاحت ایسے ہو سکتی ہے "اگر آپ ہمارے ساتھ نہیں ہیں تو آپ ہمارے خلاف ہیں" یہی جملہ آگے چل کر صدر بش نے بھی استعمال کیا کچھ ایسے تعلقات تہذیبوں کے درمیان

بھی پائے جاتے ہیں جیسا کہ امن کے علاقوں اور فساد کے علاقوں کی تقسیم ہمارے سامنے آتی ہے حیران کن بات یہ کہ امن کے علاقوں کا لیبل لگانے والے ممالک ہی فساد کے علاقوں میں فساد کا کسی حد تک باعث ہیں۔ دنیا کو ۲ حصوں میں تقسیم کرنے کے رجحان کو سیموئل بامعنی قرار دیتے ہیں اس ضمن میں جو سب سے زیادہ اہم تقسیم نظر آتی ہے وہ امیر اور غریب ترقی یافتہ و ترقی پذیر ممالک کے درمیان ہے۔ اسی طرح مغرب نے بڑے عرصے تک نوآبادیاتی نظام قائم رکھا اور مفادات حاصل کئے بغاوت اور آزادی کی جنگوں سے معاشروں نے اس سے چھٹکارہ حاصل کر لیا ہے۔ اب آزادی حاصل کر چکنے والے ملک نہ صرف جنگیں لڑ چکے ہیں بلکہ مزید تیاریوں میں مصروف ہیں اس میں سب سے اہم مثال پاکستان اور بھارت کے مابین تعلقات کی نوعیت ہے۔

مشرقی و مغربی تہذیب کے حوالے سے سیموئل کا خیال یوں ہے کہ مشرق و مغرب کی وحدت ثقافت کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی ہے دراصل مشرق و مغرب کی تقسیم پوری تہذیب کو ثقافتی حوالے سے مغربی تہذیب قرار دلانے کے غیر اخلاقی عمل سے رونما ہوئی ہے مشرق اور مغرب کہنے سے تو زیادہ اچھا یہ ہے کہ مغرب اور باقی دنیا پکارا جائے۔ اس کے بعد پہلے باب کے حصے میں سیموئل عالمی معاملات کی تفہیم کے لیے مختلف تصورات کو بیان کرتے ہیں اور ان کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہیں ان تھیوریوں میں ۱۸۴ ریاستیں شامل ہیں جس کے مطابق دنیا انتشار زدہ ہے۔ اس ضمن میں تہذیبی تھیوری اہم ہے اس تھیوری کے مندرجات ذیل میں بیان کئے جارہے ہیں جو اس کی اہمیت کو ثابت کرتے ہیں:

> دنیا میں اتحاد پیدا کرنے والے عوامل اہمیت کے حامل ہیں اس طرح وہ عوامل حقیقی ہیں جو ثقافتی اور تہذیبی شعور کو پیدا کرتے ہیں۔ دنیا مغرب اور غیر مغرب میں تقسیم ہو چکی ہے ایک طرف حاوی تہذیب یعنی کے مغرب ہے اور دوسری جانب قدرے کمزور تہذیبیں ہیں۔ عالمی معاملات میں ریاست کا کردار اہمیت کا حامل ہے قومی ریاستوں کے مفاد باہمی اتحاد اور تنازع تہذیبی اور ثقافتی عوامل کے تحت زیادہ سے زیادہ رونما ہوں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا انتشار کی جانب جارہی ہے اور ساری دنیا میں قبائلی اور قومی لڑائیاں پھیل رہی ہیں اس کے باوجود وہ تنازعے انتہائی زیادہ خطرناک ہیں جو مختلف تہذیبوں کے ملکوں یا گروہوں کے درمیان ہو رہے ہیں۔[۳]

یہ بات بھی درست ہے تنازعات ارتقائی عمل کا حصہ ہوتے ہیں جہاں حرکت ہو گی وہاں کسی نہ کسی صورت کوئی نہ کوئی تنازعہ سامنے آتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے ان تھیوریز کے گزرنے یا بیان کئے جانے کے بعد ہی کچھ کم یا زیادہ عرصے بعد صداقت سامنے آتی ہے ایسے ہی اگر ۱۹۹۳ء کے ابتدائی عرصے میں نئی تشکیل پاتی دنیا کو دیکھا جائے تو تہذیبی تھیوری کی وضاحت کا موقع مل جاتا ہے۔ کروشیا میں حکومت کے ساتھ صلح کے لیے اقوام متحدہ کی سلامتی

کونسل میں روس کا سربوں کی حمایت سے انکار، ایران اور دوسرے مسلمان ممالک کی جانب سے بوسنیا کے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے اٹھارہ ہزار فوجی بھیجنے کی پیشکش چین کا پاکستان کو مزائل سازی کا سامان دینا اور امریکہ کا چین پر پابندیاں عائد کرنا لیکن اس سب کے باوجود چین کا ایٹمی ہتھیار کی آزمائش کرنا اور امریکہ کی طرف سے سوڈان کو دہشت گرد ملکوں کی فہرست میں شامل کرنا۔ ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے تہذیبی تھیوری کی صداقت کو پرکھا جاسکتا ہے۔

نامور محققین اور دیگر علوم خصوصاً ماہر عمرانیات و بشریات نے تہذیبوں کے حوالے سے مختلف نظریات پیش کئے ہیں سیموئل نے ان تمام دانش وروں کی تحقیق کا نچوڑ اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔ جس کو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ کوئی مہذب معاشرہ کسی قدیم معاشرے سے اس لیے مختلف ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک نظم و ضبط ہوتا ہے یہ معاشرہ شہری ہوتا ہے اور اس کے افراد تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔

۲۔ تہذیب کا مطلب ہے چند مراعات یافتہ افراد یا گروہ، لیکن یہ بات بھی درست ہے ایک تہذیب اپنے اندر تہذیب یافتہ ہوتی ہے۔

۳۔ تہذیبیں مزید تہذیب یافتہ ہو رہی ہیں کہ نہیں؟ وہ عروج کی طرف یا نئی علوم کی طرف سفر کر رہیں یا ان کا زوال ہو چکا ہے۔

۴۔ جرمن فلسفیوں کے مطابق تہذیب وہ ہوتی ہے جو طاقت اور ٹیکنالوجی پر محیط ہوتی ہے جبکہ ثقافت کسی معاشرے کی اقدار اعلیٰ ترین فلسفیانہ اور اخلاقی صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔

۵۔ ماہرین بشریات کے مطابق ثقافت، قدیم، جامد، غیر شہری معاشروں کی خصوصیت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس پیچیدہ، ترقی یافتہ، شہری اور حرکت پذیر معاشرے تہذیب کہلاتے ہیں ثقافت اور تہذیب کے حوالے سے کچھ باتیں ہم آگے چل کر کریں گے۔

۶۔ تہذیب ہو یا ثقافت ہو دونوں ہی افراد کے اجتماعی انداز زیست کی ترجمانی کرتے ہیں۔

۷۔ تاریخ انسانی کی بڑی تہذیبیں اعلیٰ ترین سطح پر دنیا کے عظیم ترین مذہبوں پر استوار تھیں جو لوگ نسلی اور لسانی اعتبار سے ایک مگر مذہبی اعتبار سے الگ الگ ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کے سخت دشمن ہو سکتے ہیں جیسے لبنان، سابق یوگوسلاویہ اور برصغیر۔

۸۔ کوئی بھی تہذیب ہو وہ ایک وسیع ثقافتی وحدت ہوتی ہے۔

۹۔ تہذیبیں (ہم) ہوتی ہیں جس کے احاطے میں ہم اپنے آپ کو دوسرے (وہ) سے الگ کرتے ہیں کچھ

تہذیبوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے جیسے کہ چینی تہذیب کچھ تہذیبیں بہت کم افراد پر مشتمل ہوتی ہیں جس طرح اینگلو فون کیر بیٹن تہذیب۔

۱۰۔ تہذیبوں کی سرحدیں نہیں ہوتی ہیں اور نہ ہی ان کا آغاز و انجام کیونکہ تہذیب ایک لمبے تاریخی تسلسل پر مشتمل ہوتی ہے افراد اپنے تشخص میں تبدیلی لاتے ہیں جس وجہ سے وقت گزرنے کے ساتھ تہذیبوں کی بناوٹ میں تبدیلی آتی ہے۔

۱۱۔ تہذیبیں فنا بھی ہوتی ہیں وہ جامد نہیں متحرک ہوا کرتی ہیں وہ بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں جیسا کہ ہم نے آغاز میں کہا کہ تہذیبیں وقت کے صحرا میں دفن بھی ہو جاتی ہیں۔

۱۲۔ تہذیب کے ساتھ ایک ریاست ہوتی ہے آج کی دنیا کی اکثر تہذیبیں ایک سے زیادہ ریاستوں پر مشتمل ہیں۔

۱۳۔ دانش وروں نے تہذیبوں کی الگ الگ تعداد بتائی ہے گیگلے کے مطابق ۱۶، ٹائن بی کے مطابق ۲۱، مکینل کے مطابق ۹، بیکبی اور براڈل کے مطابق ۹، اور روسٹووانی ۷ ہم عصر تہذیبوں کا ذکر کرتے ہیں۔

دوسرے باب میں سیموئل مختلف تہذیبوں جن میں چینی تہذیب، جاپانی تہذیب، ہندو تہذیب، اسلامی تہذیب، آرتھوڈوکس تہذیب، مغربی تہذیب، لاطینی تہذیب اور افریقی تہذیب پر بات کرتے ہیں لاطینی امریکی تہذیب کے حوالے سے سیموئل لکھتے ہیں:

> امریکی اپنی ساری تاریخ میں اکثر اوقات خود کو یورپ کے برعکس کہتے آئے ہیں۔ امریکہ تو آزادی، برابری، مواقع اور مستقبل کی سرزمین تھا اور یورپ جبر و تسلط طبقاتی کش مکش، اجارے داری (اجارہ داری) کی ترجمانی کرتا تھا۔ حتیٰ کہ یہ بھی دعوی کیا گیا کہ امریکہ ایک ممتاز تہذیب ہے۔ امریکہ اور یورپ کے مابین اس اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ کم از کم انیسویں صدی کے اختتام تک غیر مغربی تہذیبوں کے ساتھ بہت محدود تعلقات رکھتا تھا۔ لیکن جب امریکہ ایک مرتبہ عالمی منظر میں ظاہر ہو گیا تو پھر یورپ کے ساتھ وسیع تشخص کا تصور بھی نمایاں ہو گیا۔۔۔۔ جہاں ۱۹ ویں صدی میں امریکہ خود کو یورپ سے ممتاز اور اس کے برعکس کہلواتا تھا وہیں ۲۰ ویں صدی میں اس نے خود کو اس وسیع وحدت کا ایک جزو قرار دلوا دیا جس کو "مغرب" کہا جاتا ہے اور جس میں یورپ بھی شامل ہے تاہم امریکہ یورپ کا صرف جزو ہی نہیں بلکہ اس کا قائد بن گیا ہے۔[۱۲]

سیموئل نے جن اشیاء یا محرکات کو تصادم کہا ہے ان کو تصادم سے ہٹ کر دیکھا جائے تو الگ طرح کی فکر سامنے آتی ہے جس طرح تہذیبوں کا موازنہ، تہذیبوں کے تعلقات وغیرہ شاید اس خیال کو لے کر چلتے ہوئے سیموئل باب دوم میں ۱۵۰۰ء سے پہلے ہونے والے تہذیبوں کے آپسی تعلقات کو بیان کرتے ہیں تہذیبوں کے درمیان زمینی

فاصلوں کی وجہ سے تجارتی و مواصلاتی روابط محدود تر ہو گئے ان فصلوں کو گھٹانے والے ذرائع بہت کم تھے صرف ایک واحد ذریعہ بحری تجارت کا تھا اس وقت بھی نظریات اور ٹیکنالوجی کی ایجادات ایک تہذیب سے دوسری تہذیب میں منتقل ہو رہے تھے لیکن ان کا میدان محدود تھا۔ جس طرح آٹھویں صدی میں چین میں طباعت دریافت ہو گئی تھی لیکن اس کو یورپ میں پہنچنے کے لیے بڑا وقت لگا یعنی کے ۱۵ ویں صدی میں پہنچی۔ کاغذ دوسری صدی میں چین میں رائج ہو چکا تھا مگر یہ ساتویں صدی میں جاپان آٹھویں صدی میں وسط ایشیا دسویں صدی میں شمالی افریقہ، بارہویں صدی میں اسپین اور تیرہویں صدی میں شمالی یورپ پہنچا۔ چین کی ایک اور دریافت بارود کئی صدیوں بعد عرب پہنچا اور یورپ میں چودہویں صدی میں متعارف ہوا۔ تہذیبوں کے درمیان روابط کی نوعیت تب حیران کن ہو جاتی ہے جب ایک تہذیب کے افراد دوسری تہذیب کے افراد پر حملہ کر دیتے ہیں اسے فتح کر کے اجارہ داری قائم کرتے عوام کو غلام بنا لیتے ہیں۔ اس نوعیت کے تعلقات تشدد سے بھرپور ہوتے ہیں لیکن قلیل مدتی ہوتے ہیں تاہم وقفے وقفے سے دوبارہ ایسے روابط قائم ہوتے رہتے ہیں۔ اسلام کے روابط ساتویں صدی عیسوی میں اس کے آغاز کے بعد سے مغرب اور ہندوستان کے ساتھ استوار رہے لیکن ان کی نوعیت کبھی مستحکم اور کبھی شدت سے بھرپور رہی۔ زیادہ تر تجارتی، ثقافتی، عسکری روابط تہذیبوں کے اندر ہی استوار ہوتے ہیں۔

کثیر التہذیبی نظام کی پیش گوئی کی گئی کہ سرد جنگ کے بعد دنیا میں تہذیبوں کے روابط کی نوعیت تبدیل ہو رہی ہے دنیا کی ایک تہذیب کی دوسری تہذیبوں پر برتری کے مرحلے سے گزر کر اس مرحلے میں داخل ہو گئی ہے جس میں دوسری تہذیبوں کے درمیان شدید دوررس اور کثیر جہتی روابط قائم ہو رہے ہیں اس حوالے سے ہیڈلے بل کہتا ہے جس کا حوالہ سیموئل نے بھی اپنی کتاب میں دیا ہے۔

> کوئی بین الاقوامی نظام اس وقت ظہور میں آتا ہے جب دو یا دو سے زیادہ ریاستوں کے مابین اطمینان بخش تعلقات موجود ہوں اور دونوں ایک دوسرے پر اثر و رسوخ کے حامل ہوں اور کسی حد تک ایک دوسرے کے ساتھ ایک کل کے اجزا کے طور پر برتاؤ کریں۔[۵]

بدلتی ہوئی دنیا اور تہذیبی اختلافات کو دیکھتے ہوئے وی ایس نائپال نے بھی ایک اصطلاح دی جس کو آفاقی تہذیب کہا جاتا ہے۔ یہ تصور دراصل نوع انسان کی ثقافتی ہم آہنگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ سارے معاشروں اور انسان میں کچھ اقدار اور کچھ ادارے مشترک ہوتے ہیں جس طرح خاندان کا ادارہ وغیرہ۔ انسانی تاریخ میں لوگوں میں کچھ اقدار مشترک رہی ہیں اس طرح اگر ایک مشترکہ آفاقی تہذیب کو مان لیا جائے تو اہم سوال ہمارے ذہنوں میں یہ آتا ہے کہ ہم ثقافتی گروہ بندیوں کو کیا نام دیں۔ آفاقی تہذیب کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے مختلف معاشروں میں مشترک باتوں کو واضح کر دیا جائے مثال کے طور پر شہر اور تعلیم ایسی چیزیں ہیں جو ان معاشروں کو قدیم اور وحشی

معاشروں سے جدا کرتی ہیں۔ اب یہاں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ کیا شہر اور تعلیم کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی یافتہ نہیں ہو سکتا یا اس راہ پر چلنے کی کوشش نہیں کر سکتا تاریخ میں بعض ایسے حوالے بھی مل جاتے ہیں کہ شہری اور تعلیم یافتہ معاشروں نے بھی ایسے رنگ دیکھائے جس کی توقع کسی وحشی معاشرے سے بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

ڈیوس کی ثقافت جس کو آفاقی تہذیب کے زمرے میں بھی لیا جا سکتا ہے جس سے مراد، مغرب کے بیشتر اور دوسری تہذیبوں کے کچھ افراد جن تصورات، اقدار اور فلسفیوں کو مانتے ہیں وہ ایک آفاقی تہذیب کہلاتی ہے۔ اس مفہوم میں آفاقی تہذیب کا نظارہ ہر سال سوئیزرلینڈ کے شہر ڈیوس میں ہوتا ہے جہاں تقریباً دنیا کی ہر ثقافت کے لوگ آتے ہیں۔ لیکن اس کو آفاقی ثقافت نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے کیونکہ جو لوگ آتے ہیں وہ کل آبادی کا صرف ایک فیصد ہوتے ہیں۔ معاشروں میں چیزوں کی مقبولیت ہو جاتی ہے چاہے ان کا تعلق الگ طرز کے سماج سے ہو اس حوالے سے سیموئل لکھتے ہیں:

> ان چیزوں کی مقبولیت سے قبول کرنے والوں کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے کسی ملک میں کچھ نوجوانوں نے جینز پہنی ہو اور کوکا کولا پیتے ہوں، ریپ میوزک سنتے ہوں، نماز ادا کرتے کرتے کسی امریکی ہوائی جہاز کو سب چھینک کر تباہ کر دیں، ستر اور اسی کی دہائیوں میں امریکہ کے لوگوں نے لاکھوں کی تعداد میں جاپانی کاریں، ٹی وی کیمرے، اور الیکٹرک آلات استعمال کئے لیکن اس سے وہ جاپانی نہیں بن گئے۔ اس کے برعکس اس عرصے میں امریکیوں کے اندر جاپان کے خلاف کافی زیادہ نفرت پیدا ہو گئی۔ مغربی لوگ صرف سادگی یا غرور کے زیر اثر ایسا سوچ سکتے ہیں کہ غیر مغربی لوگ مغربی اشیاء کو حاصل کرنے سے مغربی ہو جائیں گے۔[۷]

سیموئل امریکی پالیسیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں خصوصاً میڈیا کے ضمن میں کس طرح میڈیا ذہن سازی کرتا ہے اور کر رہا ہے اور کس طرح ریاستوں میں میڈیا کو اپنی منشاء کے مطابق چلانے کا رواج ہے یہی صورت میڈیا کے کارناموں کی ۱۱/۹ کے بعد یا فوراً بعد ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ کس طرح ایک ڈمی اسامہ بن لادن کی ویڈیو جاری کی گئی کس طرح CNN نے بار بار وہ خاص مناظر دکھائے جو لوگ ۱۱/۹ پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے اس طرح قوم ایک خاص تعصب کا شکار ہو گئی۔

زبان کسی بھی تہذیب یا ثقافت کے بنیادی اجزاء میں شامل ہوتی ہے آفاقی تہذیب کے وجود کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تہذیب کی زبان کون سی ہو گی؟ انگریزی زبان کو عالمی زبان کا درجہ دیا گیا لیکن اس کی اہم وجہ دنیا میں انگریزی زبان بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہے اگر انگریزی کو لینگوافرانکا کہا جائے تو لینگوافرانکا لسانی و ثقافتی اختلافات کو مٹانے کا باعث نہیں بنتی بلکہ یہ تو مختلف لسانی اور ثقافتی وحدتوں میں تبادلہ اور ترسیل خیالات کا ذریعہ ہوتی

ہے انگریزی کا استعمال بطور لینگوافرانکا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مختلف ثقافتوں کے لوگ اپنی اپنی ثقافتوں کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ زبان کے حوالے سے ایک اہم نکتہ طاقت کا ہے یعنی کہ دنیا میں وہی زبانیں زیادہ بولی جاتی ہیں جو طاقت ور اقوام کی زبانیں ہوتی ہیں۔ اگر طاقت کی تقسیم میں تغیر واقع ہو تو زبانوں کے استعمال میں بھی تغیر واضح ہو جاتا ہے۔ سیموئل کا خیال ہے کہ دور حاضر میں ایک آفاقی زبان کی بجائے آفاقی مذہب کے وجود میں آنے کا زیادہ امکان ہے۔ سیموئل عیسائیت کے فروغ کی وجہ مذہب کی تبدیلی کو کہتے ہیں اور اسلام زیادہ شرح پیدائش اور تبدیلی مذہب دونوں کی وجہ سے پھیلتا ہے۔ آفاقی تہذیب کے وجود میں آنے سے ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے۔ ۱۸ ویں صدی سے جاری جدیدیت کا پھیلاؤ ایک آفاقی تہذیب کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ جدیدیت درج ذیل عناصر پر مشتمل ہے:

۱۔ صنعت پذیری، شہریت پذیری، دولت اور معاشرتی آگاہی۔
۲۔ سائنسی ارتقاء کے ذریعے انسان کا اپنے ماحول پر قابو پانا۔
۳۔ قدیم معاشرے کی نسبت بڑے پیمانے کی تبدیلی لانا۔
۴۔ تعلیم، پیشے، دولت اور طبقاتی ڈھانچے کو بنیادی اساس قرار دینا۔

مغربی تہذیب کا ایک اہم عنصر اس کی انفرادیت پسندی ہے یہی خصوصیت اس کو دوسری تہذیبوں سے ممتاز کرتی ہے۔ مغربی اور غیر مغربی سب لوگوں کا متفقہ خیال ہے کہ انفرادیت پسندی مغربی تہذیب کا امتیازی وصف ہے۔ مغربی تہذیب کو مکمل انفرادی تہذیب نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ کچھ مشترکہ خصوصیات دوسری تہذیبوں میں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ اسلامی معاشرے میں قرآن اور شریعت بنیادی قوانین کا درجہ رکھتے ہیں۔ جاپان اور ہندوستان میں مغرب کی طرح کا طبقاتی نظام موجود ہے۔ شاید یہی وجہ ان کے جمہوری ہونے کی ہے۔ مغرب کی وسعت نے غیر مغربی معاشروں میں جدیدت اور مغربیت کو پھیلایا ہے ان معاشروں کے سیاسی رہنما اور دانش ور مغرب کے اثر کا رد عمل ۳ طریقوں سے دیتے ہیں۔

۱۔ جدیدت اور مغربیت دونوں کو رد کرنا۔
۲۔ جدیدت اور مغربیت دونوں کو قبول کرنا۔
۳۔ جدیدت کو قبول کرنا اور مغربیت کو رد کرنا۔

کمال ازم کا طریقہ اہم ہے جس کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں پائپس کہتا ہے:

> اسلام کے پاس کوئی دوسرا انتخاب نہیں ہے۔ جدیدیت کے حصول کے لیے مغربیت کو اختیار کرنا لازمی ہوتا ہے اسلام جدیدت کا کوئی متبادل پیش نہیں کرتا اگر مغربی تہذیب سے کچھ سیکھنا ہے تو اس کی برتری کو بھی ماننا پڑے گا جب تک مسلمان مغربی ماڈل کو واضح طور پر قبول نہیں کریں گے تو وہ نہ تو

ٹیکنالوجی حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی ارتقاء۔اس کی مثال مصطفی کمال اتاترک کی شکل میں ہمیں نظر آتی ہے۔ جس نے عثمانی سلطنت کے ملبے پر نئے ترکی کی تعمیر نو کی اور اسے مغربی وجدید بنانے کے لیے وسیع کوششوں کا آغاز کیا ایک ایسا ملک جو مذہب، ورثے، رسم و رواج اور اداروں کے اعتبار سے مسلمان تھا لیکن اس کی حکمران اشرفیہ اس کو جدید مغربی اور مغرب کا ہمسر بنانا چاہتی تھی۔ مغرب کو رد کرنے اور کمال ازم کے علاوہ ایک تیسرا راستہ یوں ہے کہ معاشرے کی مقامی ثقافت کی بنیادی اقدار، سرگرمیوں اور اداروں کو محفوظ رکھتے ہوئے جدیدیت کو اختیار کیا جائے۔[۷]

ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ مختلف تہذیبیں جو متحرک ہوتی ہیں ان کا توازن بنتا بگڑتا رہتا ہے اس وجہ سے جہاں ایک جانب مغرب کو طاقت ور تہذیب قرار دیا جاتا ہے تو دوسری جانب ایسے حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں جو غیر مغربی تہذیبوں کا عروج کی جانب سفر واضح کرتے ہیں۔ مغربی قومیں انٹر نیشنل بنکنگ سسٹم کی مالک ہیں، تمام مضبوط کرنسیوں کو کنٹرول کرتی ہیں، بڑے عالمی خریداروں میں شمار ہوتی ہیں، سرمائے کی بین الاقوامی منڈیوں پر غلبہ رکھتی ہیں بڑے پیمانے پر عسکری مداخلت کی اہلیت کی حامل ہیں، بحری گزرگاہوں پر قابض ہیں، خلائی مشن کے حوالے سے قابل ہیں، ہائی ٹیک ہتھیار بنانے کی صنعت میں برتر ہیں یہ تمام عوامل مغربی تہذیب کے عروج کے گواہ ہیں جبکہ دوسری جانب مغرب بہت تیزی سے مسائل کا شکار ہو رہا ہے مثلا معاشی پیداوار کے مسائل، جامد آبادیاں اور بے روزگاری وغیرہ عالمی اثر کے حوالے سے دیکھا جائے تو چین ایک ایسے ملک کی صورت میں سامنے آرہا ہے جو کہ مغرب کی طاقت کو چیلنج کر سکتا ہے تہذیبوں کے مابین قوت کے توازن میں ان تبدیلیوں سے مغربی تہذیبوں کی مقبولیت کم ہو رہی ہے اور غیر مغربی معاشرے اپنی ثقافت کو نئی زندگی عطا کر رہے ہیں۔ تہذیبوں کی طاقت صرف وسائل کے پیمانے سے نہیں ماپی جاسکتی ہے مثال کے طور پر آج کل کرونا وائرس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے تمام معاشرے اس سے متاثر ہوئے ہیں چاہے وہ معاشی، طبعی، سماجی سطح ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن جدول میں چین ایک ایسا ملک ہے جس نے نا صرف اس وبا کا سامنا کیا ایک پورے نظام کے ذریعے اس وبا کو قابو پالیا اس کے ساتھ ساتھ دنیا کے بیشتر ملکوں کو طبعی سامان بھی مہیا کیا یہ امر ایک غیر مغربی تہذیب کی حیثیت کو ثابت کرتا ہے۔ مغرب کے زوال کی ایک بڑی وجہ غیر مغربی تہذیبوں کی آبادی میں اضافہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ غیر مغربی تہذیبوں کے لوگ زیادہ صحت مند، زیادہ شہری، زیادہ حقوق سے آگاہ، زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ باشعور ہوتے جا رہے ہیں۔ تہذیبوں کے تقابل میں معاشی پیداوار اور عسکری طاقت کا ادراک ہونا ضروری ہے ظاہری بات ہے غیر مغربی تہذیبیں عسکری طاقت اور معاشی پیداوار کو بڑھا رہی ہیں۔ غیر مغربی تقاضوں کا احیاء یعنی مقامیت کے حوالے سے ذیل میں نکات پیش کئے جا رہے ہیں۔

۱۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس تہذیب کی طاقت میں اضافہ ہوا اس کی ثقافت نے بھی فروغ پایا۔

۲۔ پہلے تو غیر مغربی معاشرے سمجھتے تھے کہ مغرب کی معاشی خوشحالی کا راز مغرب کی اقدار ہیں وہ ان اقدار اور اداروں کو اپنے معاشروں میں جذب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

۳۔ دوسری نسل کی مقامیت بھی ایک اہم عنصر ہے جس نے سمندر پار جا کر تعلیم حاصل کی اور واپس آکر قوم کی بہبود کے لیے کام کیا اس کی واضح مثال محمد علی جناح ہیں۔

۴۔ مذہبی احیاء کو فروغ دیا جانے لگا۔

۵۔ مذہبی احیاء مغربی معاشروں کی مغرب زدگی کا استرداد ہے یہ مغرب سے ثقافتی آزادی کا اعلان ہے: ہم جدید تو بن گئے لیکن ہم مغربی نہیں بنیں گے۔

باب پنجم میں سیموئل معاشیات، آبادی اور چیلنج کرنے والی تہذیبوں کا ذکر کرتے ہیں ایسی بڑی تہذیبیں جن کا تعلق غیر مغربی تہذیبوں سے ہے اور جو مغرب کے لیے ایک طرح سے خطرہ بن سکتی ہیں ایشیائی اور مسلمان دونوں ہی مغربی ثقافت پر اپنی اپنی ثقافت کے برتر ہونے کا دعوی کرتے ہیں دیگر غیر مغربی تہذیبوں کے افراد جن میں ہندو آرتھوڈوکس، لاطینی، امریکی، افریقی، مغربی ثقافت کے مقابلے میں اپنی اپنی تقاضوں کے منفرد ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ ایشیائی چیلنج کی جڑیں اقتصادی ترقی میں ہیں جبکہ اسلامی چیلنج سماجی راہداری اور آبادی کی کثرت سے رونما ہوا ہے۔

بیسویں صدی میں مشرقی ایشیاء کی اقتصادی ترقی دنیا کی اہم ترین پیش رفتوں میں سے ایک ہیں اس عمل کا آغاز جاپان سے ہوتا ہے ایک وقت میں جاپان کو ایک ایسا مغربی ملک تصور کیا جاتا تھا جو کامیابی سے جدیدیت کو اپنا چکا تھا اور اقتصادی طور پر ترقی یافتہ تھا۔ ایک اور اہم ایشیائی معاشروں کی فی کس آمدنی کی شرح میں اضافہ ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں عالمی نظام زر میں چار ایسے ٹائیگرز ہیں جن کا تعلق ایشیاء ہیں جن میں ہانگ کانگ، تائیوان، جنوبی کوریا اور سنگاپور شامل ہیں۔ یہیں پر چین کی تہذیب کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے جس نے کمیون نظام کے بعد خود میں ترامیم کی اور اب سپر پاور کی ٹکر کا ملک بن گیا ہے۔ ایشیائی معاشرے مغرب کے مقابلے میں اپنی ثقافت کا احیاء کر رہے ہیں اس رجحان کے چار بڑے عناصر درج ذیل ہیں۔

۱۔ ایشیاء کے لوگوں کا یقین ہے کہ مشرقی ایشیاء کی تیز رفتار اقتصادی ترقی جاری رہے گی اور وہ معاشی پیداوار کے حوالے سے مغرب سے بہت آگے نکل جائے گا۔

۲۔ ایشیاء والوں کو یقین ہے کہ ان کی اقتصادی ترقی ایشیائی ثقافت کی عظیم پیداوار ہے۔

۳۔ مشرقی ایشیائی اقوام کا دعویٰ ہے کہ دیگر مغربی معاشروں کو مغرب سے مقابلے کے لیے ایشیائی ترقی اور ایشیائی اقدار کو اپنانا ہوگا۔

۴۔ ایشیاء کے لوگ اقتصادی ترقی کی وجہ سے بلند بانگ دعوے کرنے لگے ہیں اور مسلمان اسلام کو تشخص، جواز، ترقی اور قوت کے سرچشمے مانتے ہوئے اس کی طرف کثیر تعداد میں رجوع کر رہے ہیں اس لیے ان کے نزدیک اسلام امید کا سرچشمہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر مسئلے کا حل بھی ہے۔

اگر چین اسی طرح ترقی کرتا رہا تو ایشیائی اقتصادی ترقی مغربی تسلط والے بین الاقوامی نظام کا توازن بگاڑ دے گی اور تہذیبوں کے مابین قوت کے توازن میں اہم تبدیلیاں رونما ہوں گی۔

اس کے علاوہ ہندوستان تیز رفتاری کے ساتھ اقتصادی ترقی کر سکتا ہے اور عالمی معاملات میں اہم حیثیت پا سکتا ہے اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی آبادی میں اضافے سے مسلمان معاشروں اور مسلمانوں کے ہمسایہ ملکوں میں عدم استحکام رونما ہو سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعداد میں اضافے سے اسلامی احیاء کو تقویت ملے گی اسلامی عسکریت پسندی اور ترک وطن میں بھی اضافہ ہوگا ان عوامل کے نتیجے میں ۲۱ویں صدی کی ابتداء میں مغربی قوت اور ثقافت میں احیاء رونما ہو سکتا ہے اور غیر مغربی تہذیبوں کے لوگ مغرب کے ساتھ اور باہمی طور پر تصادم کا آغاز کر سکتے ہیں ایک بات ذہن میں رکھی جائے کہ یہ سب باتیں سیموئل ۱۹۹۷ء میں کر رہے تھے۔

تشخص اور شناخت چھوٹے سے چھوٹے معنوں میں اور بڑے سے بڑے معنوں میں اپنے اندر بہت سے امتیازات لیے ہوتی ہیں بعض اوقات اس کا تعلق سماجی آدرشوں سے ہوتا ہے اور بعض اوقات نہ انصافی پر مبنی ہوتا ہے۔ جدیدت کے ساتھ ہی ثقافتی خطوط پر عالمی سیاست کی نئی تشکیل کے عمل کو مہمیز ملی ہے جن لوگوں کی ثقافت یکساں ہے وہ اپنے آپسی جھگڑوں کو بھلا کر ایک ہو رہے ہیں ثقافتی اتحاد کو تقویت مل رہی ہے۔ سرد جنگ کے زمانے میں بن رہے تھے یا بنے تھے اب ان کی جگہ ثقافتی برادریاں لے رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قومی تشخص کی بحث طول پکڑ رہی ہے۔ سیموئل ایسی صورتحال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> بلقان میں نئے دور کے تقاضوں کے مطابق مسلمان اور عیسائی ملک نئے اتحاد قائم کر رہے ہے جن میں ثقافت مرکزی کردار ادا کر رہی ہے سابق سوویت یونین کی اسلامک جمہوریائیں آپس میں بھی سیاسی و اقتصادی اتحاد قائم کر رہی ہیں اور ترکی، ایران، سعودی عرب ان نئی ریاستوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی بھرپور کوششیں کر رہے ہیں برصغیر میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے حوالے سے تنازعہ موجود ہے۔ کشمیر کے اندر شورش کی وجہ ان کا باہمی عسکری توازن خراب ہو رہا ہے جب کہ ہندوستان کے اندر مسلمان اور ہندو بنیاد پرستوں میں جھگڑے شروع ہو چکے ہیں۔[۵]

تہذیبی تشخص کے وسیع درجے تہذیبی اختلافات کے گہرے شعور کو واضح کرتے ہیں اسی تہذیبی تشخص کی بنیاد پر پچھلے کچھ عرصے میں کئی تنظیمیں بھی قائم ہوئی ہیں صرف ایک ایسی تنظیم قائم ہوئی جس کا تعلق الگ معاشروں سے تھا وہ بھی جس کو ۱۹۶۷ء میں بنایا گیا۔ جس میں ایک بدھ، ایک عیسائی اور دو مسلمان ریاستیں شامل تھیں۔ تہذیبیں بنتی ہیں یا بگڑتی ہیں لیکن ان کی ساخت تو ہوتی ہی ہے اس ساخت کے حوالے سے سیموئل دوبارہ سرد جنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سرد جنگ کے دوران مختلف ممالک دو سپر پاوروں کے ساتھ وابستہ تھے اور سرد جنگ کے بعد یہ ممالک کٹے ہوئے ملکوں کی حیثیت سے جانے لگے قوموں اور قبیلوں کی طرح تہذیبیں بھی سیاسی ڈھانچے کی حمل ہوتی ہیں رکن ریاست ایسے ملک کو کیا جاتا ہے جو کسی ایک تہذیب کے ساتھ ثقافتی حوالے سے ہم آہنگ ہوتا ہے جیسے مصر اور عرب اسلامی تہذیب کے ساتھ اٹلی یورپی مغربی تہذیب کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ عام طور پر تہذیبوں کے رکن ایک یا ایک سے زیادہ مقامات کو تہذیبوں کی ثقافت کا منبع تصور کرتے ہیں یہ مقامات اکثر تہذیب کی مرکزی ریاست یا مرکزی ریاستوں میں واقع ہوتے ہیں مرکزی ریاست کسی تہذیب کی طاقتور ترین اور ثقافتی اعتبار سے مرکزی ریاست ہوتی ہے۔[۹]

کچھ ملک ثقافتی حوالوں سے تنہا بھی ہوتے ہیں جن میں اہم ملک جاپان بھی شامل ہے یہیں پر سیموئل مشورہ دیتے ہیں کہ اگر غیر مغربی معاشرے جدید ہونا چاہتے ہیں تو انہیں اپنا ایک خاص طریقہ کار اور ایک الگ تشخص قائم کرنا پڑے گا نہ کہ مغربی طریقے کی نقل کرنا ہوگی ان کو اپنی تہذیبی اقدار سے رجوع کرنا پڑے گا۔

ناٹو فورسز کے پیچھے بھی ایک تہذیبی عمل کار فرما ہے ذرا ہم ناٹو کے قیام کی طرف غور کریں تو یہ کچھ ایسے ملکوں کی مشترکہ تنظیم ہے جو مجموعی مفادات کے لیے کام کرتی ہیں اس میں وہ معاشرے شامل ہیں جن کے کچھ نا کچھ تہذیبی اشتراکات موجود رہے ہیں۔ وسطی یورپ میں سوویت یونین کی سیاسی اور فوجی توسیع کی وجہ سے سرد جنگ شروع ہوئی امریکہ اور مغربی یورپ کے ملکوں نے اس کی توسیع کو روکنے کے لیے ناٹو کو قائم کیا۔

چین جو کہ ایک معروف غیر مغربی تہذیب ہے سیموئل نے اپنے کتاب میں اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے جس کے کچھ نکات کو ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

۱۔ چین خود کو تاریخی طور پر ایک چینی سلطنت کا بنی تصور کرتا ہے۔

۲۔ چینی حکومت لمبے عرصے تک دوسرے ملکوں کی کیمونٹ پارٹیوں کے ذریعے اپنے مفادات حاصل کرتی رہی ہیں۔

۳۔ چینی حکومت کے نزدیک چینی نسل کے لوگ خواہ وہ کسی دوسرے ملک کے شہری ہوں وہ چینی برادری کا

حصہ ہیں۔

۴۔ چینی وہ ہیں جو ایک نسل، خون اور ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں۔

۵۔ عظیم چین کوئی مجرد تصور نہیں ہے بلکہ یہ ایک ترقی پذیر ثقافتی واقتصادی حقیقت ہے۔

۶۔ چینی ثقافت ایک سیاسی حقیقت کی صورت میں ابھر رہی ہے۔

۷۔ مشرقی ایشیاء کی معیشت چین کے گرد گھومتی ہے۔

۸۔ چین کے ارتقاء میں ہانگ کانگ، تائیوان، سنگاپور کا اہم کردار ہے۔

۹۔ بات صرف چین کے ضمن میں آکر ہی ختم نہیں ہو جاتی ہے اگر ہم ایشیاء ٹائیگر کی بات کریں تو جس طرح اس ملک کو کاروباری شہر کا نام دیا گیا تو اس کا سب سے بڑا سبب چین کی سنگاپور کے ساتھ شراکت داری ہی ہے۔

اسلام جس میں حکمرانی کے انداز با جمہوریت سے الگ ہیں اور ان قوانین کا طریقہ کار بھی جدید سے بہت الگ ہے ہمیں معلوم ہے کہ اسلام میں قبیلہ اور امت مرکز رہے ہیں اور قومی ریاست کی اہمیت کم ہی رہی ہے ایک نہایت اہم بات مسلمان اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ حاکمیت صرف اللہ ہی کی ہے دراصل سیموئل جب مسلم معاشرے کو بیان کر رہے ہیں تو ان کا اصل مقصد اس غیر مغربی تہذیب کا عروج کی جانب سفر ہے اور اس کی سخت میں ہونے والی حیران کن تبدیلیوں کو اجاگر کرنا ہے۔ جس طرح وہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ابھرتے ہوئے شعور کو بیان کرتے ہیں کہ اب مسلمان دانش وروں اور عالموں کے اجلاس زیادہ تعداد میں منعقد ہو رہے ہیں جو تہران، مکہ اور کوالالمپور جیسے مراکز میں منعقد ہوتے ہیں اسلامی شعور سے اسلامی اتحاد کی جانب سفر کو سیموئل نے دو صورتوں میں بیان کیا ہے جو اس سفر میں مشکل پیدا کرتی ہیں۔

۱۔ ہر معاشرہ مختلف مراکز پر مشتمل ہوتا ہے اسلامی قوت بھی ایسے ہی مرکز میں تقسیم ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ مسابقت کا شکار ہیں اس میں ہر ایک کوشش کرتا ہے کہ امت میں اس کی رہنمائی میں اسلامی تشخص کو ترویج ہو جو اسلامی اتحاد میں اضافہ کرے اس طرح ایک مقابلے بازی کا ماحول بن جاتا ہے یہ مقابلہ ایک طرف تو مضبوط حکومتوں اور ان کی تنظیموں میں ہو رہا ہے اور دوسری طرف اسلام پسند حکومتوں اور ان کی تنظیموں میں جاری ہے۔ ۱۹۹۵ میں PAIC کی تیسری کانفرنس ہوئی جس کی میزبانی خرطوم نے کی اس کانفرنس میں ۸۰ ملکوں کی اسلام پسند تنظیموں کے نمائندوں نے شرکت کی ان رسمی تنظیموں کے علاوہ افغانستان کی جنگ کے نتیجے میں غیر رسمی اور زیر زمیں گروہ پیدا ہوئے جو الجیریا مصر، تیونس، بونسیا، چیچینا(Chachina) فلسطین اور ہر جگہ اسلام پسندی کے لیے مصروف جنگ ہیں۔ جنگ کے بعد ان کے عہدے ان جنگجوؤں کے ساتھ تبدیل ہو جاتے ہیں جو پشاور کے باہر واقع

یونیورسٹی آف دعوۃ جہاد میں تربیت پاتے ہیں۔ یہاں تک جو سیموئل نے اشارہ کیا ہے جس بات کے مضمرات ہم آج تک بھگت رہے ہیں کس طرح ہم نے مجاہد پیدا کئے کیسے امریکہ کی ایماء پر ہم نے روس کو شکست دی اور کیسے انہی مجاہدین میں نئے کچھ گروہوں نے پاکستان میں دشت گردی کو فروغ دیا دوسری جانب ۱۱/ ۹ کا واقعہ رونما ہو گیا جس سے ہمارا تشخص تاریک ہو کر رہ گیا۔

۲۔ عثمانی سلطنت کے خاتمے سے اسلام مرکزی ریاست سے محروم ہو گیا اس کے علاقوں کو مغربی طاقتوں نے باہم تقسیم کر لیا ۲۰ ویں صدی میں کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں تھا جو اتنی طاقت، ثقافت اور مذہبی جواز رکھتا ہو کہ دوسری مسلم ریاستیں اور غیر مسلم ملک اسے اسلام کا رہنما مان لیتے۔

۳۔ انڈونیشیا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اس کی معاشی ترقی میں بھی بہت اضافہ ہوتا جا رہا ہے اس کا اسلام سخت نہیں بلکہ نرم رویے کا حامل ہے اس کے لوگوں کی معاشرت میں ایک ملغوبے کا گمان ہوتا ہے مگر یہ اسلام کے نواح میں اور عرب مرکز سے بہت دور واقع ہے۔

۴۔ مصر آبادی کے لحاظ سے بڑا ملک ہے اس کی اہمیت، مرکزی، عسکری، تعلیمی حوالے سے بہت زیادہ ہے یہ ملک اسلامی علوم کا صف اول کا ادارہ جموالازیر رکھتا ہے یہ ملک مشرق وسطی میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے لیکن مصر غریب ملک ہے اور اقتصادی اعتبار سے دوسری ریاستوں پر انحصار کرتا ہے۔

۵۔ پاکستان رقبہ، آبادی اور اس کے ساتھ ساتھ اہم عنصر عسکری قوت بھی رکھتا ہے پاکستان اسلامی ریاستوں کے درمیان تعاون کا فروغ دینا اور بقیہ دنیا کے لیے اسلام کا ترجمان ہے لیکن یہ غریب ملک ہے گروہ بندیوں کا شکار ہے۔ سرحدی حدود کے مسائل پر الجھا رہتا ہے چین و امریکہ کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات ہیں۔

۶۔ سودی عرب کی سرزمین اسلام کا اصل منبع ہے یہاں اسلام کے مقدس ترین مقامات موجود ہیں یہ مک دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخائر کا ملت ہے اس لیے مالیاتی اثر ورسوخ رکھتا ہے اس ملک کی کم آبادی اور جغرافیائی طور پر کمزور محل ووقوع اسے اپنی حفاظت کے لیے مغرب پر انحصار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

۷۔ ایران ایک وسیع آبادی والا مسلم ملک ہے لیکن اس ملک کی مرکزیت کی راہ میں اس کا مسلک حائل آتا ہے ایران کی آبادی کی اکثریت شیعہ ملک سے وابستہ ہے۔

۸۔ ترکی ایک منفرد ملک ہے جو مسلمانوں کے ساتھ تاریخی رشتہ رکھتا ہے۔ اتاترک نے عثمانی سلطنت کے اثرات سے آزاد کروانے کے لیے ترکی کو جو سیکولر تشخص دیا وہی اس کی مرکزیت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

مندرجہ بالا بحث میں ایک بات کا تسلسل سے ذکر چلتا آیا ہے مغرب کا امتیاز، مغرب کی انفرادیت پسندی

جہاں یہ امر اتفاقی ہے وہیں پر اختیاری بھی ہو سکتا ہے جو مسائل مغرب اور باقی دنیا کو تقسیم کر رہے ہیں ان کی تعداد بنیادی طور پر تین ہے۔ اول ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کی روک تھام اور مغربی فوجی برتری کو قائم رکھنا۔ دوم، دیگر معاشروں کو مجبور کر کے مغربی سیاسی اقدار اور اداروں کو ترویج دینا۔ انسانی حقوق جو ہر معاشرے میں الگ نوعیت کے ہوتے ہیں، انسانی حقوق کے مغربی تصور اور مغربی جمہوریت کو قبول کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا۔ سوم مغربی معاشروں کے ثقافتی سماجی اور نسلی اتحاد کو محفوظ رکھنے کے لیے غیر مغربی لوگوں کی امیگریشن پر پابندی لگانا۔ سوان تینوں معاملات کے حوالے سے مغرب کو غیر مغربی ملکوں کے مقابلے میں اپنے مفادات کے فروغ میں متواتر مشکلات کا سامنا ہے۔

سرد جنگ کے بعد سے اب تک ایک الگ رجحان سامنے آنے لگا ہتھیاروں کی دوڑ میں ملک نے نت نئے ہتھیار بنانے شروع کر دیئے یا ان ہتھیاروں کا لین دین شروع ہو گیا ان میں جیٹ ہوائی جہاز مزائل کا ساز و سامان، ہنیہ اسلحہ، وغیرہ شامل ہے۔

ہجرت اور نقل مکانی بظاہر تو ایک ہی لفظ لیکن ان کے معنی الگ الگ ہیں نقل مکانی ازل سے انسان کی فطرت میں شامل رہی ہے ناموافق حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے کے لیے انسان کے پاس آخری حربہ نقل مکانی ہی تو رہ جاتا ہے تاریخ انسانی کے ارتقاء کا ایک بنیادی امر نقل مکانی ہی ہے سرد جنگ کے بعد جب معاشروں نے اپنی تہذیبی و ثقافتی اساس کی جانب پلٹنا شروع کیا تو نقل مکانی کا عنصر تہذیبی اساس کے لیے خطرہ لگنے لگا کہ کس طرح ایک نقل مکان یا قدرے برے الفاظ میں تارک وطن دوسری معاشرت میں آکر بنیادی طور پر ایک ایسے ملغوبے کے تحت زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس میں کچھ چیزیں اس کی پیدائشی زمین کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں اور کچھ چیزیں نئی معاشرت کے ڈھانچوں میں ڈھلی ہوتی ہیں۔ شہر کی دہائی میں یورپی ملک عمومی طور پر نقل مکانی کی حمایت کیا کرتے تھے لیکن ۸۰ کی دہائی کے بعد ہمیں ان کے مزاج میں تبدیلی نظر آتی ہے: بے روزگاری کی زیادہ شرح تارک وطن کی تعداد میں اضافہ، نقل مکانی کرنے والوں کا گھر یورپی کردار یہ اہم وجوہات تھیں اس طرح کی کچھ تبدیلیاں امریکہ کو بھی اپنی پالیسیوں میں کرنی پڑیں آج کل ٹرمپ حکومت کا تارکین وطن کے ساتھ سلوک ایک سفاکی کی علامت کی صورت میں نظر آتا ہے۔

مرکزی ریاستوں اور تقسیمی خط کے تصادمات حوالے سے سیموئل لکھتے ہیں:

> تہذیبیں انسانوں کے قبائل ہوتی ہیں اور تہذیبوں کا تصادم عالمی سطح پر قبائلیوں کا تصادم ہوتا ہے تشکیل پذیر دنیا میں دو مختلف تہذیبوں کی ریاستیں اور گروہ کسی تیسری تہذیب کے خلاف اپنے مفادات کی ترویج یا دیگر مقصد کے زیر نظر محدود اور عارضی عسکری تعلقات اور اتحاد قائم کر سکتے

ہیں۔ تاہم مختلف تہذیبوں کے گروہوں کے روابط کبھی قریبی نوعیت کے نہیں ہوتے بلکہ عموماً سرد اور معاندانہ رہتے ہیں۔ [10]

سیموئل کا خیال یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آخر میں اسلام اور عیسائیت کے درمیان تنازعہ بڑھ گیا ہے اس ضمن میں وہ چار بنیادی وجوہات کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ مسلمان آبادی میں اضافے سے ایک بڑی تعداد میں مایوس نوجوان پیدا ہوئے ہیں جو بیروزگار ہیں یہی آگے چل کر اسلام کی افرادی قوت بڑھاتے ہیں ان میں اکثر نوجوان اپنا ملک چھوڑ کر مغربی ملکوں میں چلے گئے ہیں۔

۲۔ اسلامی احیاء کی وجہ سے مسلمانوں میں مغرب کے مقابلے میں الگ تشخص کا احساس ابھرا ہے اور مسلمانوں کو اپنی تہذیب اور اقدار کی قدر و قیمت کا احساس ہوا ہے۔

۳۔ مغرب اپنی اقدار اور اداروں کو آفاقیت کا حامل کرار دلوانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی عسکری ارا قتصادی بالادستی کو برقرار رکھنے کے اقدامات کئے ہیں۔ مغرب نے اسلامی ملکوں کے تنازعوں میں مداخلت کی ہے اس وجہ سے مغرب کے خلاف مسلمانوں میں نفرت پیدا ہو گئی ہے۔

کیمونزم کے ختم ہونے سے مغرب اور اسلام کا مشترکہ دشمن فنا ہو گیا ہے اس کے نیچے میں دونوں مذاہب ایک دوسرے کے لیے بڑا خطرہ بن گئے ہیں۔

مغرب کا اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں بلکہ خود اسلام ہے جو ایک مختلف تہذیب ہے جس کو ماننے والے اپنے تشخص کی فوقیت کے علاوہ طاقت کی کمتری کا شکار ہیں۔ دوسری طرف خود مغرب مسئلہ ہے مسلمانوں کے لیے جو کہ مختلف تہذیب ہے جس کو ماننے والے اپنی ثقافت کی آفاقیت کے قائل ہیں یہ بنیادی عوامل اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم کو فروغ دے رہے ہیں۔ ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے سیموئل لکھتے ہیں:

> ہندوستان کے تعلقات مغرب کے ساتھ فاصلاتی نوعیت کے ہیں وہ چین اور پاکستان کے ساتھ جنگیں کر چکا ہے۔ سرد جنگ کے بعد کے زمانے میں پاکستان کے ساتھ اس کے تعلقات کشمیر، ایٹمی ہتھیاروں، اور برصغیر میں مجموعی فوج توازن کے حوالے سے کشیدہ ہیں۔ پاکستان دوسرے اسلامی ملکوں کی حمایت حاصل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے لہذا بھارت کے ان ملکوں کے ساتھ تعلقات انتہائی پیچیدہ ہیں اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہندوستان فرداً مسلمان ملکوں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے نہ کہ وہ انہیں پاکستان سے دور کر دے۔ [11]

سیموئل اپنی کتاب کے دسویں باب میں غیر مغربی معاشروں خصوصاً مسلمان معاشروں کے حوالے سے بات کرتے ہیں اور اس باب کو مترجم نے عبوری جنگیں اور تعلیمی اور تقسیمی خط کی جنگیں کا نام دیا ہے۔ اس میں سیموئل

افغانستان اور خلیج کی جنگیں، سوویت یونین اور افغانستان، اسلام پسند تنظیمیں عرب کی اور دوسرے مسلم ممالک کی ملی معاونت، مجموعی طور پر مغرب کی مخالفت، عرب اور کوویت کے تعلقات مسلمانوں کے آپس کے تعلقات، شریعت کے نفاذ میں مسائل، فرقہ ورانہ فسادات، ایک دوسرے کو کافر کہنا اور خون ریزی کرنا اور مذہبی یا لسانی بنیادوں پر جھگڑے وغیرہ جیسے عوامل پر بات کی ہے۔ سیموئل مسلمانوں کے حوالے سے اپنی رائے جس کا اظہار انہوں نے اپنی کتاب میں ایک سے زائد بار کیا ہے کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> آخری بات جو سب سے زیادہ اہم ہے کہ مسلمان معاشروں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ اس کی اکثریت بے روزگار ہے جن کی عمریں ۱۵ — ۳۰ سال کے درمیان ہے یہی نوجوان آدم استحکام اور تشدد کا سب سے بڑا منبع ہیں اس نسل کی عمر میں اضافہ اور معاشی ترقی مسلمانوں کے تشدد کے رجحانات میں نمایاں کمی کر دے گی اور اس کے نتیجے میں تقسیمی خط کی جنگوں کا تسلسل اور شدت دم توڑ دے گی۔ [۱۲]

تقسیمی خط کی جنگوں میں ریاستوں اور گروپوں کی شمولیت کے مدارج الگ ہوتے ہیں شروع میں دو فریق ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے لڑ رہے ہوتے ہیں دوسرے درجے کے فریق ریاست سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے درجے کا شرکار اکثر تہذیب کی مرکزی ریاستیں ہوتی ہیں۔ پہلے درجے میں عام طور پر افراد اور ہتھیار فراہم کئے جاتے ہیں دوسرے اور تیسرے ملکوں کے مفادات بہت پیچیدہ ہوتے ہیں عمومی طور پر وہ تقسیمی خط کی دوسری طرف کے فریقوں سے مذاکرات کرتے ہیں تاکہ کچھ صلح صفائی کا ماحول پیدا ہو سکے۔ نوے کی دہائی میں ہونے والی سب جنگوں میں تارکین وطن اور ہم رشتہ ملک ملوث ہوئے۔ ایسی جنگوں میں مسلمان ملکوں کو پہلے درجے کا وسیع کردار ادا کرتے ہوئے مسلمان حکومتوں اور تنظیموں کا حصے رہے۔ سعودی عرب پاکستان، ایران، ترکی اور لیبیا کی حکومتیں سب سے زیادہ فعال تھیں جن کے ساتھ بعض اوقات دوسری مسلم سیاستیں بھی شامل ہوئیں انہوں نے غیر مسلموں سے لڑنے والے مسلمانوں کو مختلف مسلم معاشروں میں مدد کے لیے بھیجا چین، بوسنیا، فلپائن وغیرہ حکومتی امدار کے علاوہ افغانستان کی جنگ میں شریک اسلام پسند بین الاقوامی تنظیمیں اور دوسرے درجے کے مسلم گروپوں نے بھی تعاون کیا جو کہ الجیریا کی خانہ جنگی سے چیچنیا اور فلپائن تک محیط ہے۔ کشمیر کی جنگ میں پاکستان باغیوں کی سفارتی اور سیاسی مدد کھلم کھلا کرتا رہا ہے اور پاکستانی فوج ذرائع کے حوالے سے روپے، ہتھیار، اور جائے پناہ بھی فراہم کی گئی۔ فلپائن میں موجود باغیوں کو ایک زمانے میں ملائشیا سے مدد ملتی رہی۔ سری لنکا میں باغی ہندو تاملوں اور بدھ حکومت کے درمیان جنگ میں ہندوستان اور باغیوں کو بھرپور مدد دی۔ دوسرے اور تیسرے درجے کی پارٹیوں کی امداد تقسیمی خط کی جنگ سے شروع ہونے اور اس کے ختم ہونے میں جوہری کردار ادا کرتی ہیں۔ سربوں، کروٹوں اور مسلمان سبھی نے اپنے تہذیبی رشتہ داروں سے مدد حاصل کی جو کہ سابق لوگوسلاویہ سے باہر تھے اور ان سے سرمایہ، ہتھیار، فوجی تربیت اور

دیگر امداد حاصل کی۔ رابرٹ پٹ کے مطابق ایک مکمل جنگ کو رکوانے کے لیے دوسرے اور تیسرے درجے فریقوں کی بھرپور شرکت، جنگ روکنے کے لیے وسیع شرائط پر مزاکرات، لالچ اور حکمت عملی کا استعمال، مختلف طریقوں کے ذریعے ان کو قائل کرنا جیسے عوامل ضروری ہے۔

تہذیبوں کا مستقبل سیموئل کی کتاب کا آخری اور اہم باب ہے جس میں انہوں نے بہت سے اہم نکات اٹھائے ہیں جن کو اختصار کے ساتھ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

۱۔ جو معاشرے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی تاریخ ختم ہو گئی ہے وہ ایسے معاشرے ہوتے ہیں جن کی تاریخ زوال کا شکار ہوتی ہے۔

۲۔ اسلامی احیاء اور ایشیاء کی معاشی ترقی سے پتا چلتا ہے کہ دیگر تہذیبیں زندہ ہیں اور مغرب کے لیے ایک خاموش خطرہ ہیں۔

۳۔ مغرب کے معاشرہ اخلاقی زوال کا شکار ہوتا چلا جارہا ہے۔

۴۔ جن ملکوں کے رہنماؤں نے اپنے ثقافتی ورثے کو رد کر کے اپنے ملک کے تشخص کو ایک تہذیب کی بجائے دوسری تہذیبوں سے متعین کروانے کی کوشش کی وہ کامیاب نہیں ہوئے۔

۵۔ امریکہ کے لوگ جب اپنی جڑوں کی تلاش کرتے ہیں تو خود کو یورپ میں پتے ہیں انکے پاس اس کا کوئی متبادل نہیں ہے۔

۶۔ امریکی حکومت ایک ایسے زمانے کو تسلیم کرنے میں غیر معمولی دشواریوں سے دوچار ہے جس زمانے میں عالمی سیاست کی تشکیل ثقافتی اور تہذیبی بنیادوں پر ہو رہی ہے۔

۷۔ امریکہ کو کثیر التہذیبی دنیا کے تقاضوں کو تسلیم کر لینا چاہیے۔

۸۔ یورپ اور امریکہ کو سیاسی معاشی اور فوجی روابط کو وسعت دینی چاہیے، یورپی یونین اور ناٹو کو توسیع دینی چاہیے، دوسری تہذیبوں کے اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہیے، دوسرے ممالک پر اپنی ٹیکنالوجی اور فوجی برتری کو قائم رکھنا چاہیے۔

۹۔ ابھرتے ہوئے نئے عہد میں تہذیبوں کے تصادم دنیا کے امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔

۱۰۔ اس تصادم سے بچنے کا ایک طریقہ تہذیبوں کی بنیاد پر قائم کیا جانے والا ایک بین الاقوامی نظام ہی ہے۔

سیموئل نے جب تہذیبوں کے تصادم کو نظریہ پیش کیا جو اس پر مختلف طرح سے رد عمل ہوا کہیں پر تحسین سے نوازا گیا اور کہیں تردید کی گئی اگر اس نظریے کو ہمارے اپنے معاشرے کے حوالے سے دیکھا جائے تو وہ لوگ اس

TH-26202

بات پر تالیاں بجاتے رہے کہ مغرب کا زوال ہو رہا اور غیر مغربی تہذیبیں خصوصاً مسلمان عروج کی منازل طے کرتے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ سیمینار اس موضوع پر سجائے گئے کچھ مقالہ جات تحریر کئے گئے اس میں ایک اہم کتاب Clash of civilization in traditional Islamic discourse جو دسمبر ۲۰۱۸ء میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ شاہنواز فاروقی صاحب کی ہے جس میں انہوں نے اس نظریے کی اساس اور اس کے مضمرات پر اپنے نقطہ نظر کے مطابق روشنی ڈالی ہے۔ اس سے پہلے بھی اردو دنیا میں متعدد کتب اس موضوع پر شائع ہو چکی ہیں۔

کتاب کے منظر عام آنے کے بعد اس کتاب کو بہت شہرت ملی لیکن اب اس کے سازشی عناصر سامنے آتے جا رہے ہیں۔ مغرب ہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے حلقوں کے دانشور اس حوالے سے سوچ رہے ہیں کہ یہ کتاب امریکی اسٹیبلشمنٹ کے اشارے پر لکھی گئی جس کا مقصد دنیا کی آنکھوں میں خوب دھول جھونکنا تھا۔ تہذیبوں کا تصادم ایک متنازع نظریہ ہے سیموئل نے اس نظریے کو شہرت بخشنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایم ایچ خان نے اپنے مضمون تہذیبوں کے تصادم میں لکھا ہے:

> سیموئل کے ناقدین روایتی تہذیب کو یہ کہتے ہوئے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ وہ جدید دور کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتی ہیں اس کے خیال میں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ بیشتر قدامت پسند تہذیبیں اپنے آپ کو تبدیل کرنے سے گریزاں ہیں اس ذیل میں جاپان ایک ایسی مثال ہے جسے بنیاد بنا کر کئی پسماندہ تہذیبیں اپنے لیے نیا جہاں پیدا کر سکتی ہیں۔ [۳۱]

تہذیبوں کے تصادم کے حوالے سے محمد احسن بٹ لکھتے ہیں:

> مجموعی طور پر "تہذیبوں کا تصادم" مغربی تہذیب کے امریکی حصے کی تازہ حکمت عملی کو منکشف کرتی ہے جس کے مطابق اٹھائے گئے اقدامات کو ساری دنیا کے غیر مغربی لوگ خصوصا برصغیر کے مسلمان ان دنوں ملاحظہ کر رہے ہیں۔ اور ایسا دکھائی پڑتا ہے کہ آنے والے پورے عشرے میں مغرب اپنی بقا کے لیے غیر مغربی خصوصا اسلامی، چینی اور اس خطے کی دوسری تہذیبوں کے خلاف جاری کاروائیوں میں مزید اضافہ کرے گا اور دنیا تاریخ میں رونما ہونے والے بڑے المیوں اور خون ریزیوں کو مستقبل میں بہت معمولی کہے گی۔ [۳۲]

دور حاضر کی عالمی سیاست کو سمجھنے کے لیے ایک سوال ہمارا معاون ہو سکتا ہے کہ دنیا بھر میں بہت ساری اسلامی اور غیر اسلامی تحریکیں ہیں جو امریکہ، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کے خلاف جنگ کر رہے اب سیموئل جیسے لوگ یہ کہیں گے کہ دراصل یہ تو دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہے مسلمان جو کہ جدید دنیا کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکے ان کے پاس سائنس اور ٹیکنالوجی نہیں ہے تو اب یہ لوگ اپنا غصہ مغرب کی طرف اتار رہے ہیں اور جو چیز ان کے تجزیے سے

غائب ہے وہ بہت اہم ہے یاد رہے کہ ان عوامل اور تنظیموں کو فروغ دینے میں مغربی ممالک کا بہت بڑا کردار رہا ہے اور شروع کے چالیس پچاس سالوں کے سیاسی نقشے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

اس طریقے سے ہم اس امر کو سوچنے میں مجبور ہو جاتے ہیں کہ سیموئل نے مغرب کو مشورے تو دیئے لیکن مغرب کی اس سازشی پالیسیوں کو بہت کم شامل بحث کیا ہے۔

سیموئل کو ایک نظریہ ساز مفکر کہا جاسکتا ہے جب مختلف دانشوروں نے باالخصوص مغرب اور بالعموم مشرق کے علماء نے اس نظریے کو پرکھا تو اس اصطلاح کی کئی صورتیں سامنے آئیں اگر ہم اپنے یہاں کی بات کریں تو کسی نے تہذیبوں کے تصادم کو تہذیبوں کے موازنے کا نام دیا کسی نے تہذیب کی بحث کو آگے بڑھایا تو کسی نے تہذیب کی اصطلاح اور اس کی اساس کی وضاحت کرنا شروع کر دی۔ کہیں پر اسے کفر و ایثار کی جنگ کہا گیا تو کہیں پر اسے مغرب اور مشرق کا ٹکراؤ کہا گیا۔

حوالہ جات

۱۔ مائیکل ڈبنز، "مردہ جھیل" مشمولہ تہذیبوں کا تصادم، سیموئل پی ہنٹنگٹن ترجمہ محمد احسن بٹ (لاہور: نگارشات پبلشرز، ۲۰۱۹ء)، ص ۱۱۔

۲۔ سیموئل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، ترجمہ محمد احسن بٹ (لاہور: نگارشات پبلشرز، ۲۰۱۹ء)، ص ۱۴۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۵۔

۴۔ ایضاً، ص ۳۸۔

۵۔ ایضاً، ص ۴۵۔

۶۔ ایضاً، ص ۵۰۔

۷۔ ایضاً، ص ۶۱۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۵۱۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۶۴۔

۱۳۔ احمد سہیل، "کیا سیموئل پی ہنٹنگٹن کا تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ ایک سازشی ٹوپی ڈرامہ ہے؟" http:facebook.com بتاریخ ۲۱ اپریل ۲۰۲۰ء، ۹ بجے رات۔

۱۴۔ سیموئل پی ہنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم، ترجمہ محمد احسن بٹ، ص ۱۰۔

باب دوم:

ناول ساسا میں تہذیبی اختلافات

باب دوم:

ناول ساسا میں تہذیبی اختلافات

کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرز زندگی اور طرز فکر واحساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چناں چہ زبان آلات پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، فنون لطیفہ ، علم وادب، فلسفہ وحکمت، عقائد وافسوں، اخلاق وعادات، رسوم وروایات ، عشق ومحبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔ ہر قوم کی ایک تہذیبی شخصیت ہوتی ہے۔اس شخصیت کے بعض پہلو دوسری تہذیبوں سے ملتے جلتے ہیں، لیکن بعض ایسی انفرادی خصوصیات ہوتی ہیں جو ایک قوم کی تہذیب کو دوسری تہذیبوں سے الگ اور ممتاز کردیتی ہیں۔ ہر قومی تہذیب اپنی انہی انفرادی خصوصیات سے پہچانی جاتی ہے۔

تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے اور وضع کے لحاظ سے اس کا استعمال "اندارائن (ایک قسم کا کڑوا پھل) سے رس نکال کر اس کی تلخی دور کرنے اور کھانے کے قابل بنانے" کے لیے ہوتا ہے۔ تہذیب اور مذہب عربی کے لفظ ذھب سے مشتق ہیں جس کا لغوی معنی "راستہ" ہے۔ مطلب جس پر چلا جائے یا اس کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ اس کے مزید معنی گزرنا، مرنا، لے جانا، ساتھ جانا، جگہ سے ہٹانا وغیرہ ہیں۔ اور اسلام کی اصطلاح میں لفظ مذہب "رائے یا مسلک" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ الفاظ جب ایک زبان سے دوسری زبان میں آتے ہیں تو ہیئت کے ساتھ ساتھ مطلب بھی بدل لیتے ہیں۔ عربی سے ہی یہ لفظ مستعار لے کر اردو میں مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا۔

۱۔ اصلاح، پاک کرنا، صفائی، آراستگی۔

۲۔ ذہنی ترقی جو زندگی کے چلن میں کار فرما ہو، شائستگی، ادب وتمیز۔

۳۔ طرز معاشرت، رہنے سہنے کا انداز، تمدن۔

۴۔ ترقی، بہتری۔

۵۔ کسی کتاب وغیرہ کی ترتیب تدوین، درست کرنا۔

۶۔ تصوف میں نفس یا قلب کی صفا وجلا کے لیے۔

چوں کہ تہذیب کی کوئی جامع تعریف اب تک سامنے نہیں آئی ہے اس لیے ہر دور کے مختلف ماہرین و مفکرین نے مختلف انداز میں تہذیب کی وضاحت کی ہے۔ بنیادی طور پر تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے جسے درخت یا پودے کو کاٹنے چھانٹنے کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے جب کہ فارسی زبان میں یہی لفظ کسی چیز کو سجانے اور

سنوارنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اس کے سب سے مشہور معنی ہیں پاکیزہ و پسندیدہ اخلاق و آداب کے ہیں۔ تہذیب کا لفظ نہ صرف اردو میں بلکہ عربی اور فارسی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں لفظ تہذیب کے معنی ہیں درخت کو تراشنا اور فارسی زبان میں اس کے معنی ہیں آراستن و پیراستن، پاک و درست اصلاح نمودن۔ اسے شائستگی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے جس میں خوش اخلاقی مزاج کی نرمی، اور اطوار و کردار و گفتار کی شائستگی بھی شامل ہے۔ جیسے کہا جائے وہ مہذب انسان ہے تو اس کے معنی ہیں کہ اس کا بات چیت کا انداز شائستہ ہے۔ سرسید احمد خان تہذیب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> سویلائزیشن انگریزی کا لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق اور معاملات، معاشرت اور تمدن و طریقہ تمدن، صرف اوقات، علوم اور ہر قسم کے فنون کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچنا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصل خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔[1]

یعنی انسان کے تمام انفرادی افعال جو انسان کی خارجی اور ظاہری زندگی کا مکمل احاطہ کرتے ہیں تہذیب کے زمرے میں آتے ہیں۔ انسان کی معاشرتی اور سماجی زندگی کو ایک نظام کا پابند کرتے ہیں۔ اس نظام میں انسان کے اخلاقی اقدار فنون لطیفہ وغیرہ سب شامل ہوتے ہیں یہی وہ تمام عناصر ہیں جن سے ایک فرد کا اپنی معاشرتی اور سماجی زندگی میں واسطہ پڑتا ہے۔ ایک عام آدمی کے نزدیک تہذیب ایک مکمل لائحہ عمل اور بڑی حد تک زندگی گزادنے کا وہ طریقہ ہے جسے اختیار کرتے ہوئے وہ اپنی زندگی گزارتا ہے۔ تہذیب کسی فرد پر زبردستی مسلط نہیں کی جاسکتی بلکہ انسان اسے آہستہ آہستہ اپناتا ہے۔

تہذیب اقدار کے باضابطہ شعور کا نام ہے جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے۔ مشترکہ قواعد و ضوابط اور اقدار کی تشکیل اچانک نہیں ہو جاتی بلکہ یہ مسلسل عمل ہے۔ اقدار کو تہذیب کی شکل اختیار کرنے کے لیے طویل وقت درکار ہوتا ہے۔ اس سفر کے دوران جو وقت حالات اور جغرافیائی تبدیلیاں یا دیگر تہذیبوں کے ساتھ باہمی میل جول سے ان اقدار کی شکل میں بہت سی تبدیلیاں وقوع پذیر ہونے کہ وجہ سے تہذیب نشو نما اور تغیر و تبدل کے عمل سے گزرتی ہے۔

انسانوں کا ایک گروہ کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں، ان کے لباس، ان کی معلومات، ان کے خیالات، سب یکساں ہوتے ہیں۔ تہذیب وہ مشترکہ عادات ہیں جو افراد کے باہمی تبادلہ خیال یا ان کے سماجی روابط

اور عقیدے کے باعث یکساں ہوتی ہیں۔ رفتہ رفتہ افراد کے درمیان تشکیل پانے والے یہ مشترکہ خیالات اور عادات معاشرے کے لیے لازم حیثیت اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ قوائد و ضوابط رسم و رواج کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

ہر تہذیب میں دوسری تہذیب کو متاثر کرنے کی اہلیت ہوتی ہے۔ لسانی عناصر، جغرافیہ اور مذہب کا اختلاف تہذیبوں کو ایک دوسرے سے مختلف بنانے کا باعث بنتا ہے لیکن جغرافیائی تاریخ اور انسانی روابط کے باعث ہر تہذیب میں کچھ مشترکہ چیزیں بھی موجود ہوتی ہیں۔

بعض ماہرین سماجیات تہذیب کو کسی ایک قوم کی تشکیل اور ملکیت نہیں مانتے کیونکہ ان کے مطابق کوئی تہذیب کسی قوم کی مالک نہیں ہو سکتی ہے یہ تہذیب مختلف قوموں کی اجتماعی کوششوں یا مختلف تہذیبوں کے اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے۔

تہذیب کسی نہ کسی حد تک دوسری تہذیب سے جڑی ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں کسی ملک کو بین الاقوامی تہذیب سے الگ نہیں دیکھا جا سکتا۔ کوئی تہذیب کسی جغرافیے میں قید نہیں رہتی اور نہ ہی اس کا متعین آغاز اور انجام ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تہذیب کو کبھی زوال نہیں آتا یہ نہ تو تہذیب اچانک تشکیل پاتی ہے اور نہ ہی اس کا ایک دم سے خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہی تسلسل تہذیبوں کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق:

> تہذیب ایک تسلسل کا نام ہے اور یہ دریا کے بہاؤ کی مانند ہے ایسا دریا کہ اس کا منبع کہیں دور ماضی بعید کی تاریکی میں نہاں ہے اور اس دریا کے مختلف مقامات پر ابھرتی اور ڈوبتی لہریں کلچر۔[۲]

تہذیب تو ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے اس لیے یہ عمل کبھی جمود کا شکار نہیں ہوتا ہے اور ایک تسلسل کے ساتھ اس میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں دوسری جانب تبدیلیوں کا یہ سلسلہ نہایت مربوط ہوتا ہے اور ہر زمانہ تہذیبی رشتوں کے ذریعے ماضی سے بڑا ہوتا ہے اس لیے تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے ماضی حال و مستقبل کو اہمیت دی جاتی ہے۔

کوئی بھی تہذیب یک دم سامنے نہیں آتی ہے بلکہ اس کے ساتھ روایت شامل ہوتی ہے اور اس میں صدیوں کا سفر لگتا ہے جب کچھ لوگ یا کوئی گروہ کسی مخصوص جگہ پر اکٹھا رہنا شروع کر دیتا ہے تو اس میل ملاپ کے نتیجے میں ایک معاشرہ تشکیل پاتا ہے اس سے اگلا مرحلہ تہذیب کا ہے۔

بہت سے مفکرین تہذیب کو کسی قوم کی ترقی کی اعلیٰ ترین سطح قرار دیتے ہیں۔ مختلف ماہرین نے تہذیب کو ایک اجتماع کی ایسی اعلیٰ ترین سطح یا کمال قرار دیا ہے جہاں ترقی اور تخلیق کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد انحطاط کا آغاز ہوتا ہے۔ تہذیب صرف ان معاشروں یا افراد سے مخصوص نہیں ہے جو اعلیٰ ذہنی و فنی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں بلکہ اس کے دائرہ کار میں ہر طرح کے قبیل کے افراد آتے ہیں۔

تہذیب کے ساتھ عام طور پر کلچر اور ثقافت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنی موقع عمل کے حوالے سے بدل جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود تہذیب، کلچر اور ثقافت میں فرق رہتا ہے۔ تہذیب کو عموماً طرز زندگی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے جس میں ہماری معاشرت اور اخلاق شامل ہیں جب کہ ثقافت علوم وفنون اور ادبیات سے جڑی ہوتی ہیں مگر دیکھا جائے تو جب تہذیب اور ثقافت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو عمومی طور پر ذہن میں دونوں معنی موجود ہوتے ہیں اور یہ دونوں معنی مل کر ہی ایک وحدت اور اکائی بناتے ہیں۔

ثقافت تہذیب کی ابتدائی شکل کا نام ہے جو نسل در نسل کے عمل سے تشکیل پاتی ہے اس کا تصور اس قدر وسیع ہے کہ اس میں وہ تمام چیزیں آسکتی ہیں جن کو انسانی فکر اپنی گرفت میں لاسکتی ہے۔ ثقافت کا ماخذ انسان اور اس کے ارد گرد کے تجربات ہیں جن کی روشنی میں نظام زندگی کو وہ مرتب کرتا ہے ثقافت مذہب سے اثر انداز تو ہوتی ہے لیکن یہ کوئی مذہبی بندش یا کسی آمر کا حکم نہیں ہے ثقافت افراد معاشرہ کی زندگی اور ان کے رویے کے اندر گھل مل کر ان کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے لیکن اس عمل میں طویل وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ثقافت ایک پابندی کا نام ہے جو افراد معاشرہ کی زندگی کو قاعدے کا پابندی کرتی ہے۔

ثقافت کو معاشرے کی روح مانا جاتا ہے۔ ثقافت کی ضرورت واہمیت ایک طرف لیکن اس کی حدود میں وہ وسعت اور پائیداری نہیں ہوتی جو تہذیب میں ہوتی ہے۔ ثقافت کے یہی تمام مظاہر جب عوامی سطح پر اتر کر اور تقلیدی انداز اختیار کر کے دور دور تک پھیل جاتے ہیں تو تہذیب کہلاتے ہیں اور وہ ثقافت جو جغرافیائی حد بندیوں میں جکڑی ہوتی ہے تہذیب کی صورت اختیار کرکے اکثر جغرافیائی حد بندیوں کو بھی پار کر جاتی ہے۔

تہذیب ثقافت ہی کے پھیلاؤ کا دوسرا نام ہے اور ثقافت تہذیب کی وہ صورت ہے جو بنیادی طور پر تخلیقی ہے جب کہ تہذیب اس صورت کا نام ہے جو تقلیدی ہے بقول سجاد نقوی:

> کلچر اور تہذیب میں وہی فرق ہے جو بیج کے مغز اور چھلکے میں ہوتا ہے کلچر مغز ہونے کے باعث تخلیق کا منبع ہے جب کہ تہذیب کی حیثیت اس محافظ کی سی ہے جو چھلکے کی صورت میں مغز کی حفاظت کرتا ہے۔ کلچر بنیادی طور پر کومل، گداز، قوت کی نمو کا خزینہ اور ارتقاء کا محرک ہے جب کہ تہذیب اور قدروں، قوانین وضوابط رسوم ورواج کے تابع اور اسی لیے بیضوی لپٹی ہوئی اور بے لچک ہے۔[۳]

تہذیب اور ثقافت دو الگ الفاظ نہیں بلکہ دو الگ حیثیتیں ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت گہری وابستگی رکھتی ہیں۔ اس لیے ثقافت کو بڑی حد تک تہذیب کا جزو مانا گیا ہے۔ کسی ثقافت کی جڑیں عوام میں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ ایک عوامی مزاج کا حصہ بن جاتی ہیں مذہب اور تاریخی ورثے کی شمولیت اسے زیادہ متاثر کر دیتی ہے۔ ایک طرح سے یہ ایک تخلیقی قوت کا نام ہے جو کسی معاشرے کے افراد میں بہت گہری رچ بس چکی ہے۔ تہذیب

اگر ایک درخت کے حسن و خوبصورتی کی مانند ہے تو ثقافت اسی درخت کی شاخیں ہیں جن پر پھول لگتے ہیں اور درخت کے حسن و خوبصورتی کو دو گنا کرتی ہے تہذیب کو افراد کی ایک ثقافتی گروہ بندی بھی کہا جاتا ہے۔ تہذیب ہماری حیات کے ظاہری پہلو کا نام ہے اور ہمارے اندرونی اور داخلی افکار و احساسات ہماری ثقافت سے جڑے ہوتے ہیں۔ تہذیب اور ثقافت جن کو ہم مترادف کے طور پر استعمال کرنے لگے ہیں ان میں ایک مضبوط تعلق موجود ہے جس کے باعث ان میں جزوی فرق ہونے کے باوجود ان میں کوئی واضح حد نہیں کھینچی جا سکتی لیکن ان دونوں کے فرق کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

تہذیب کے ساتھ ثقافت کے علاوہ ایک اور لفظ کلچر بھی اہم ہے ہمارے یہاں تو خصوصاً پاکستان کے قیام کے بعد کلچر کے مباحث کے حوالے سے کئی ادوار سے گزرا ہے کلچر کا لفظ (KULT) سے ماخوذ ہے جس کے رومن میں معنی کھیتی باڑی کے علاوہ ذہنی تربیت اور مذہبی عقائد وغیرہ کے ہیں۔

کلچر انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ہل چلانا، پالنا اور تربیت دینا۔ کسی کھیت میں ہل چلا کر اسے نرم کرنا، کھاد ڈالنا، بیکار بوٹیوں کو اکھاڑنا اور اسے پانی دینا ہے۔ کلچر کی وحدت اور وسعت کو مختلف ماہرین نے مختلف انداز میں بیان کیا ہے کلچر مجازی معنوں میں دانش، علم، مطالعہ اور ایمان کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ حقیقی معنوں میں کھانا، لباس، گھر، اخلاق، فلسفہ، فنون لطیفہ اور ادب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

کسی معاشرے کے افراد کی روز مرہ زندگی میں شعوری سطح پر داخل ہونے والی اقدار، خیالات اور اطوار سب کے سب انسان کے کلچر کے اظہار ہیں۔ کلچر فنون لطیفہ، مذہب، سیاست تک ہی محدود نہیں رہتا ہے بلکہ یہ ہماری زندگی کی زیادہ تر عادات و اطوار کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جس طرح تہذیب و ثقافت ایک ہوتے ہوئے بھی مختلف ہیں اس طرح کلچر بھی تہذیب کا مترادف نہیں ہو سکتا ہے یہ بھی تہذیب کا ایک جزو ہے۔

تہذیب کے ساتھ ساتھ تمدن کا لفظ بھی تقریباً انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تمدن کا لفظ مدن سے نکلا ہے جس کے معنی شہریت اختیار کرنا ہے اور شہر بسانا ہے اسی لفظ سے مدینہ ہے جس کے معنی شہر کے ہیں۔ تمدن کے معنی کسی جغرافیہ میں رہنے والے افراد کے طور طریقے ہیں کیوں کہ وہ افراد جو کسی شہر یا علاقے میں رہتے ہیں اپنی ایک الگ تمدنی شناخت رکھتے ہیں۔۔ یہاں اس نوعیت کا سوال ذہن میں آتا ہے کہ شہروں کے بننے سے پہلے انسانی گروہ جو تہذیب رکھتے تھے اگر اس ڈھانچے کو تمدن کا نام نہیں دیا جا سکتا تو پھر اسے کیا نام دینا چاہیے؟ شاید وہ تہذیبی یا تمدنی ڈھانچے ہماری تہذیب یا تمدن کی تعریف پر پورے نہ اترتے ہوں لیکن وہ تمدنی اشکال تو ضرور تھیں۔ یعنی تمدن اور تہذیب دو مختلف اصطلاحات ہیں لیکن کسی کو دوسرے کا مترادف نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

بعض مفکرین تہذیب اور تمدن کے معنوں میں تفریق کرتے ہیں،۔ تمدن کو انسان کی خارجی ترقی اور تہذیب کو داخلی یا ذہنی ارتقا سے تعبیر کرتے ہیں لیکن کچھ مفکرین کے نزدیک تمدن انسان کے خارجی اور اس کے ذہن کے عمل ورد عمل ہی کی ایک تخلیق ہے۔ دراصل تہذیب کا تعلق روحانی عقائد سے ہے اور یہی عقائد جب عمل کی صورت میں سامنے آتے ہیں تو یہ تمدن کہلاتا ہے۔ڈاکٹر عابد حسین کے الفاظ میں:

> تمدن تہذیب کا مادی پہلو ہے یہ اسی وقت ظہور میں آتا ہے جب تہذیب عملی شکل اختیار کرتی ہے۔ کسی قوم کا تمدن اس کی تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے تہذیب کی تکمیل کے لیے مادی وسائل کی بھی ضرورت ہے۔ ابتداء میں مادی ترقی کی وہ منزل جس میں انسان ایک بہت بڑی تعداد میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا یعنی شہر آباد ہونے لگے 'تمدن' کہلاتی ہے۔ [۴]

زرعی انقلاب کے بعد جب انسان نے فصلیں اگانے کا طریقہ دریافت کر لیا اور دریاؤں کے کناروں پر مستقل رہائش اختیار کرنے لگا تو اس نے زندگی کو ایک تمدنی شکل دینی شروع کی اور دور وحشت سے نکل کر تمدن کے دور میں داخل ہو گیا۔ تمدن اور تہذیب کو ہم معنی سمجھنے کا تصور مغرب سے مشرق کی جانب آیا ہے۔ مغرب کا جھکاؤ چوں کہ مادیت کی طرف ہے اس لیے انہوں نے تمدن کو ہی تہذیب کی بنیاد سمجھا۔

تمدن ایک خاص مادی اصطلاح ہے جو تہذیب کی ایک ابتدائی شکل ہے جب کہ تہذیب ایک یکسر مختلف مفہوم کی حامل اصطلاح ہے جس کی حیثیت خارجی ہے اور اس کی بنیاد عقائد پر ہے۔ڈاکٹر غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

> یہ چاروں الفاظ ہم معنی ہیں ان میں بعض خصوصیات مشترک ہیں لیکن ان میں معمولی سا فرق بھی موجود ہے۔ 'کلچر' ایک نقطہ نگاہ کا نام ہے اس کا عملی اظہار تہذیب ہے کلچر صرف ذہن کا عمل ہے اور تہذیب ذہنی تصورات اور خارجی اعمال کا مجموعہ ہے۔۔۔۔۔ ثقافت کا تعلق علوم و فنون سے ہے، تمدن کا عمارت و باغات سے ہے۔ کلچر کا دانش ذہنی تصورات اور ایمانیات سے جب کہ تہذیب ایک عام چیز ہے جو ان تینوں پر حاوی ہے۔ [۵]

دراصل تہذیب ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی کا ایک ایسا طریقہ ہے جو کسی قوم یا گروہ انسانی کے باہمی اشتراک سے وجود میں آتی ہے اور اس کے بعد نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس میں ہمارا مذہب جغرافیہ، اعتقادات، تاریخ اور ترجیحات سبھی شامل ہیں۔

تہذیب افراد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی، رویوں، اور رسم و رواج سے متعلق ہے۔ اس کی تشکیل کسی فرد واحد کا کام نہیں ہے بلکہ یہ افراد کی مشترکہ طرز زندگی کا نام ہے اس لیے تہذیب کی تشکیل میں فرد، جماعت اور

معاشرہ بنیادی عناصر ہیں کیوں کہ تہذیب افراد کے اسی مجموعے سے متعلق ہے اور اس مجموعے کا ہر عنصر یکساں اہمیت کا حامل ہے۔

فرد سے مراد واحد ہے جو ناقابل تقسیم ہے۔ جس کی اپنی ایک الگ اور انفرادی حیثیت اور پہچان ہوتی ہے اور یہی اجتماعی حیثیت معاشرتی زندگی کا ڈھانچہ ترتیب دینے، اسے منظم رکھنے اور اسے چلانے کا فریضہ ادا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ بنیادی سماجی و سیاسی ادارے ہوں یا معاشرہ اور ریاست، ان تمام اداروں کا بنیادی مقصد فرد کی فلاح و بہبود ہے۔ خاندان ہو یا ریاست یہ تمام تر ادارے اور سماجی، معاشی، اخلاقی اور مذہبی اصول و قواعد فرد کے لیے اور فرد سے ہے۔ خاندان، گروہ، قبیلہ، جماعت، قومیں اور معاشرے افراد کے اجتماع کی مختلف صورتوں کے نام ہیں اور اگر فرد کا وجود نہ ہو تو یہ تمام معاشرتی ادارے اپنی افادیت، اہمیت، حتیٰ کہ وجود بھی کھو دیتے ہیں۔ ہر اجتماعی عمل، نظریے یا اختراع کی بنیاد فرد پر ہوتی ہے ایک گروہ یا معاشرہ بطور گروہ یا معاشرے کے کوئی اختراع یا ایجاد نہیں کرتے بلکہ یہ انفرادی اظہار ہوتا ہے جسے گروہ اپنا لیتے ہیں۔ فرد ایک عنصر کی حیثیت میں معاشرے یا گروہ کی تشکیل کرتے ہیں جس کے نظام کو چلانے کے لیے اجتماعی قواعد و ضوابط، اصول، مفادات، نظریات، رسوم و رواج اور روایات و حقوق تشکیل پاتے ہیں۔ ہر فرد کو معاشرے کے قواعد و ضوابط اور تہذیب و روایات کو اپنانا ہوتا ہے اور ان سے بغاوت کی صورت میں معاشرہ فرد کو اپنانے سے انکار کر دیتا ہے۔ ہر فرد کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اجتماعی مفادات کے حصول کے لیے کام کرے اور ان تمام اقدار اور اصول حیات کو قبول کرے جن کو معاشرہ پسند کرتا ہے اور ایسے افعال سے گریز کرے جو معاشرے کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔

کسی معاشرے کی تہذیبی زندگی کا تمام تر ڈھانچہ فرد سے بنتا ہے اور اسے افراد کے لیے ہی بنایا جاتا ہے تاکہ افراد کی اجتماعی زندگی میں آسانیاں پیدا کی جا سکیں۔ معاشرے اور تہذیب کی تخلیق کے پیچھے فرد کی ذات کارفرما تھی کیوں کہ تنہا حیثیت میں فرد بالکل بے یار و مددگار ہے اسی لیے اس نے مل جل کر رہنے اور آپس میں تعلقات تشکیل دینے کی کوشش کی اور معاشرہ اسی کوشش کا نتیجہ ہے۔ فرد کی معاشی، معاشرتی اور سماجی زندگی مضبوط ہوتی ہے اور یہی انسان کی معاشرتی، تمدنی اور تہذیبی زندگی کا آغاز ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین درویش کے مطابق:

> فرد کو اس کی پیدائش کے ساتھ ہی موافق بنانے کے لیے تمام معاشرہ روایات، مذہب، رسوم، اخلاقیات اور ریاستی قوانین اس کی نگرانی شروع کر دیتے ہیں۔ جب تک وہ فرد صحیح معنوں میں ریاست کا مثالی شہری نہ بن جائے اس وقت تک تمام پابندیاں اپنا کام جاری رکھتی ہیں۔[۶]

کسی فرد یا افراد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نظریات، عقائد، طرز زندگی اور حقوق و فرائض سے معاشرتی زندگی کا توازن قائم کرے۔ ان پابندیوں کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرد میں وحشیانہ پن یا غرور اور انا پرستی کے رجحانات فروغ نہ پائیں تاکہ افراد کی مثبت حیثیت اور شخصیت کو ابھرنے کے بھرپور مواقع میسر آسکیں۔

ایک قوم یا معاشرے کے اندر بہت سی جماعتیں ایک ہی وقت میں موجود ہوتی ہیں لیکن ان تمام جماعتوں میں کہیں نہ کہیں ہم آہنگی موجود ہوتی ہے جو معاشرے کی تشکیل کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ معاشرہ کسی تہذیب کے آغاز، بقا اور ارتقا کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں مختلف جماعتوں اور گروہ ملتے ہیں۔ کوئی بھی معاشرہ اپنی انفرادی تہذیب سے پہچانا جاتا ہے اور تہذیب معاشرے کی ضروریات کے مطابق پروان چڑھتی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد صلاح الدین کے مطابق:

> اپنی پرورش، خوراک، لباس، رہائش اور تعلیم و تربیت کی ضرورت ہی کے لیے نہیں بلکہ اپنی فطری صلاحیتوں کے نشو نما (کی نشو نما) ارتقاء اور ان کے عملی اظہار کے بھی وہ اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں یہ اجتماعی زندگی اسکے (اس کے) گرد تعلقات کا ایک وسیع تانا بانا تیار کرتی ہے۔ خاندان، برادری، محلہ، شہر، ملک اور بحث مجموعی پوری نوع انسانی تک پھیلے ہوئے تعلقات کے یہ چھوٹے بڑے دائرے اس کے حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہیں۔ [۲]

جب انسان فطری زندگی چھوڑ کر مدنی زندگی یعنی شہری زندگی میں قدم رکھتا ہے تو حقوق و فرائض، تعلقات، پابندیاں انسان کی زندگی کو ایک سانچے میں ڈھالتے ہیں اور افراد کے درمیان فکر و عمل کی یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی عوامل افراد کو مل جل کر قدرتی، جغرافیائی اور دیگر حالات کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہونے میں مدد دیتے ہیں۔ انسان فطری طور پر معاشرت پسند ہے اسی فطری تقاضے نے اسے اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔

اپنے ہم جنس کے ساتھ مل جل کر رہنے کی خواہش اور ضروریات انسانی کی فراہمی معاشرے کی ابتدا کی بنیاد بھی ہے اور انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کو زیادہ سے زیادہ منظم اور مضبوط رکھنے کے لیے معاشرتی پابندیوں اور ذمہ داریوں کو قبول بھی کیا۔ یہ معاشرتی پابندیاں کبھی تو فرائض کی صورت میں ہوتی ہیں تو کبھی اخلاقی یا مذہبی پابندیوں کی صورت میں۔ یہی معاشرتی پابندیاں، ضروریات اور تقاضے ثقافت کی تشکیل کرتے ہیں جو تہذیب کی صورت میں اس معاشرے کی پہچان بنتی ہے۔ ڈاکٹر افضال بٹ کے مطابق:

> معاشرہ یا سوسائٹی انسانوں کے اس گروہ کو کہتے ہیں جو باہمی تعلق و تعامل کے اعتبار سے افرادی خصوصیات کا حامل ہو اس میں اقدار حیات اور ثقافت و تہذیب کے ساتھ ساتھ ذہنی و روحانی، نظریاتی

اختصاص اس طور پر موجود ہو جو ایسے دیگر مشابہ گروہوں سے ممتاز کرے۔ نیز جذباتی واحساساتی اور شعوری وغیر شعوری سطح پر اس کے وحدتی کڑیاں مضبط ہو۔[۵]

کوئی فرد اپنی مرضی سے تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ معاشرہ انسان کو زندگی بسر کرنے کے طریقے سکھا دیتا ہے۔ تہذیب معاشرے کو ایک اجتماعی طاقت فراہم کرتی ہے جس کی بنیاد پر معاشرہ بین الاقوامی سطح پر پہچانا جاتا ہے۔ ہر تہذیب کا اپنا راہ عمل ہوتا ہے۔ وہ افراد کو ایسا ماحول اور سہولیات فراہم کرتی ہے جس میں فرد کی سیرت سازی اور کردار سازی ہوتی ہے اور اس طرح معاشرے کا ہر فرد تہذیب کے انفرادی تشخص کا آئینہ بن جاتا ہے۔ معاشرہ فرد کا نگہبان بھی ہے اور محاسب بھی۔ فرد کی صلاحیتیں معاشرے میں ہی اجاگر ہو سکتی ہیں اور معاشرہ ہی ان کو نکھارتا ہے۔ معاشرہ صرف افراد کے مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ یہ روابط کے اس نظام کا نام ہے جو افراد اور ان کے مجموعے کے درمیان پایا جاتا ہے۔

دراصل تہذیب فرد اور اس کی اجتماعی زندگی کے ایک ایسے نظام کا نام ہے جو اسے اجتماعی زندگی گزارنے کے اصول بتاتا ہے۔ تہذیب کی تشکیل کے لیے فرد انفرادی طور پر ہو یا گروہ کی شکل میں، وہ معاشرے کے لیے بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تہذیب معاشرے کو منظم کرنے کے ایک لائحہ عمل کا نام ہے جو افراد کی زندگی کو ایک نظام کا پابندی کرتی ہے اسی لیے فرد، جماعت، معاشرہ اور تہذیب باہم لازم وملزوم ہیں جس کے مقاصد انتہائی اعلیٰ وارفع ہیں۔

تمدن کی تعریف اور اس کے عناصر کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں اب ہم ذرا انسانی تمدن کے آغاز وارتقا کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تہذیب کب اور کن عناصر سے وجود میں آتی ہے اس کا حتمی طور پر جائزہ لینا تقریباً ناممکن ہوتا ہے کیوں کہ تہذیب صدیوں کے سفر اور کئی عناصر کے مجموعے سے تشکیل پاتی ہے۔ کسی تہذیب کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس کے داخلی اور خارجی عناصر کو حتمی طور پر طے کر دینا شاید سب سے دشوار اور نازک کام ہے کیوں کہ کسی تہذیب کی تشکیل میں لاتعداد عوامل وعناصر کارفرما ہوتے ہیں جو اپنی اصل شکل تبدیل کر کے ایک تہذیبی ڈھانچے کی شکل اختیار کر چکے ہوتے ہیں اور اس کے اندر داخل ہو کر اس کی روح کا ایک اہم حصہ بن چکے ہوتے ہیں۔

تہذیب کے عناصر میں عقیدہ، تاریخ، جغرافیہ، مذہب، زبان، اقدار اور روایت، طبعی حالات، معاشی حالات اور سماجی ضروریات وتقاضے سبھی شامل ہیں۔ یہ تمام حالات وواقعات مل کر کسی گروہ کے افراد کی ضروریات، تقاضے، عادات واخلاق اور اقدار کی تشکیل کرتے ہیں جس کے مجموعے کو تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ یعنی تہذیب ایک کل ہے جو ان تمام اجزا سے مل کر تشکیل پاتی ہے۔

تہذیب وتمدن کی ابتدا اور آغاز وارتقا انسانی شعور اور معاشرتی زندگی کے آغاز کے ساتھ منسلک ہے۔ جب انسان نے گروہ کی صورت میں زندگی کا آغاز کیا تو اس کی معاشرتی زندگی کی ضروریات پڑھنے لگی اور کسی معاشرتی زندگی

کو منظم و مربوط کرنے کے لیے اخلاقی، مذہبی اور سماجی حدود کے تعین کی ضرورت پڑی جن کے اندر رہتے ہوئے انسان نے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے اصول و ضوابط کا تعین کیا۔ جو اقدار و روایات کی صورت میں رفتہ رفتہ ان گروہوں کی شناخت بنااور وہی اقدار وروایات وسیع پیمانے پر تہذیب کے ساتھ سانچے میں ڈھلتی چلی گئی۔

انسان اپنی ابتدائی زندگی میں مکمل طور پر قدرتی حالات اور طبعی ماحول کے تابع تھا۔ یہ طبعی عناصر جہاں انسانوں کے لیے خوف اور خطرہ کا باعث تھے وہیں انسان کی تمام تر ضروریات بھی انہی سے پوری ہوتی ہیں۔ رفتہ رفتہ انسانوں نے اس خوف پر قابو پاناسیکھ لیااور شاید انسان کی یہی کاوش تہذیب کی جانب انسان کا ایک اہم ترین قدم ہے۔

تہذیب کے ابتدائی دور میں انسان کی زندگی کے ہر لمحے پر فطرت کا اثر تھا۔ وہ نا تو اس ماحول کو بدلنے کی صلاحیت رکھتا تھااور نہ ہی اس قدر طاقت کا حامل تھا لیکن پھر ایک وقت آیا جب انسان نے مجبوری کے تحت فطرت کی طرف قدم بڑھایا یہیں سے ہی ارتقائے انسانی کا باقاعدہ آغاز ہوااور یہ انسان کا تمدن کی جانب پہلا قدم بھی تھا اس لحاظ سے دیکھا جائے توانسان کی ساری زندگی قدرت کی تسخیر کی تاریخ ہے۔

انسان نے تمدن کی جانب سفر کا آغاز کب کیا یا کب انسان کی معاشرت کو تمدنی معاشرت کا آغاز تسلیم کیا جائے اس کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں زرعی انقلاب کا بغور جائزہ لینا پڑے گا۔ زرعی انقلاب کے آغاز نے معاشرتی زندگی کا ڈھانچہ بدلنا شروع کر دیا۔ جوں جوں کھیتی باڑی کا نظام ترقی پانے لگا دیگر شعبوں نے بھی وسعت اختیار کرنا شروع کر دی اور مختلف لوگوں نے اپنی اپنی مہارتوں کے مطابق پیشے اختیار کرنے شروع کر دیے۔ بستیاں آباد ہوئیں اور معاشی گروہ بندی ہونے لگی۔ جس زمانے میں انسان پتھر یا ہڈی کے آلات واوزار استعمال کرتا تھا تو اس کا رہن سہن رسم و رواج ۔۔۔ سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز یعنی اس کی تہذیب مختلف تھی لیکن جب کانسی کے آلات واوزار نے رواج پایا تو معاشرے کا پورا بالائی ڈھانچہ بدل گیا۔ لوگوں نے جنگل بیابانوں میں مارے مارے پھرنے کی بجائے چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد کر لیں۔ مویشی پالے، کھیتی باڑی شروع کی، ہنر اور پیشے وجود میں آئے۔ زندگی گزارنے کے ایسے طریقے متعین کیے گئے، طرز فکر واحساس کا ایک نظام قائم ہو گیا جو پتھر کے زمانے کے سماجی نظام سے بالکل مختلف تھا۔

انسانی معاشرے کی گروہی تقسیم بھی زرعی سماج کی پیداوار تھی۔ جب انسان نے زراعت شروع کی مویشی پالے تو اس طرح قدرتی آفات میں اناج کی حفاظت کا سوچا اس کے لیے قبیلے کے طاقت ور افراد کو حفاظت کے لیے چن لیا گیا جو اس کام کے بدلے اناج میں سے اپنا حصہ لیا کرتے تھے بعد میں جب ان میں سے کچھ لوگوں کے پاس وافر مقدار میں اناج جمع ہو گیا تو ان لوگوں نے سرداری کا دعویٰ کر دیا۔ پھر رفتہ رفتہ فوج وجود میں آگئی اور فطرت کے خلاف اپنا

دفاع کرنے کے لیے اور شکار کرنے کی غرض سے مختلف طرح کے ہتھیار بنائے گئے۔ یہی ہتھیار قبیلوں، برادریوں اور گروہوں کی باہمی لڑائی اور ایک دوسرے کی ذخیرہ شدہ خوراک پر قبضے کے لیے کام آئے۔ غالب آنے اور مغلوب آنے کی کشمکش کے نتیجے میں معاشرہ طبقات میں تقسیم ہوا۔ یہ تبدیلیاں یا ترقیاں کسی ایک تہذیب یا علاقے میں نہیں بلکہ اپنے ارتقائی مرحلے پر تمام تہذیبوں میں ہوئیں۔ ارتقائی سفر اسی طرح ہی چلتا رہا۔ یہاں تک کہ انسان نے قدرتی غاروں کی رہائش کو چھوڑ کر میدانوں میں رہنا شروع کیا تو اپنے لیے مکان بنانے لگے۔ موسمی اثرات سے خود کو بچانے کے لیے پہلے کھالوں اور پھر کپڑوں سے خود کو ڈھانپنا شروع کیا۔ زبان کے طفیل ادب نے فروغ پایا، جذبات و احساسات کو با قائدہ اظہار کا راستہ مل گیا۔ انسانوں کے درمیان سماجی رابطہ ممکن ہوا جس نے انسانوں کو باقی تمام تر مخلوقات سے ممتاز حیثیت عطا کی۔ آج جب ہم یہ کہتے ہیں کہ دنیا ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے تو یہ زبان کی بدولت ممکن ہوا اس کا دوسرا عنصر ذرائع ابلاغ اور ابلاغ کے طریقے ہیں۔ بقول سبط حسن:

> زبان انسان کی سب سے عظیم الشان سماجی تخلیق ہے۔ اس کے ذریعے سے انسان اپنے تجربات، خیالات اور احساسات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے اور چیزوں کا رشتہ زمان و مکان سے جوڑتا ہے یعنی کہ وہ دوسروں سے ماضی، حال، مستقبل اور دور و نزدیک کے بارے میں گفتگو کر سکتا ہے اور اس طرح آنے والی نسلوں کے لیے تہذیب کا نہایت بیش قیمت اثاثہ چھوڑ جاتا ہے۔[9]

خوشی غمی کی رسومات ہوں یا میلے ٹھیلے اور تہوار ہماری خوراک ہو یا لباس سبھی مذہبی اقدار کے دائرے میں تشکیل پاتے ہیں۔ دراصل مذہب بھی تہذیب کی اساس ہوتا ہے کیوں کہ یہ کسی معاشرے کے نظام فکر واحساس کی تشکیل کا ایک اہم جزو ہے اسی کی بنیاد پر کسی معاشرے میں سماجی شعور تشکیل پاتا ہے۔

تمدن کا آغاز مذہب اور انجام سائنس پر ہوتا ہے۔ مذہب اور سائنس کے تعلق پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بعض دانش وروں نے مذہب کی تعلیمات کو سائنس کی مدد سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعضوں نے مذہبی تصورات کو سائنسی حوالوں سے جھٹلایا ہے گویا مذہب اور سائنس کے حوالے سے مختلف آرا سامنے آتی ہیں۔

مفکرین کے نزدیک مذہب اور سائنس کو اپنے اپنے دائروں میں ہی رہنا چاہیے۔ کچھ مفکرین کے نزدیک مذہب تہذیب کا ایک جزو ہے اور کچھ کے نزدیک تہذیب مذہبی اساس پر مشتمل ہوتی ہے لیکن ایک بات ضرور دھیان میں رکھنی چاہیے کہ تہذیب صرف مذہب نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی مذہب سے جنم لیتی ہے۔ تہذیب میں مذہب بھی ہے فن تعمیر بھی ہے، فنون لطیفہ بھی ہے، شعر وادب بھی ہے اور رسم ورواج کے ساتھ ساتھ تاریخی حالات واقعات بھی۔

تہذیب کی تشکیل میں طبعی حالات کو بڑا دخل ہوتا ہے یعنی یہ تہذیب کا اپنا ایک مخصوص جغرافیہ ہوتا ہے اس

کے دریا، پہاڑ، جنگل، میدان، پھل پھول، سبزیاں، چرندپرند وجانور، آب وہوا، موسم یعنی خارجی ماحول اسکے طرز عمل ، ذریعہ معاش، رہن سہن، خوراک و پوشاک ، مزاج واخلاق، اخلاق وعادات، جذبات واحساسات غرض یہ کہ اس علاقے کے انسانوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریگستانی علاقوں کی تہذیب، قطبیت شمالی کے برف پوش پہاڑوں کی تہذیب سے مختلف ہوتی ہے اور سمندر دریاؤں کے کنارے بسنے والوں کی تہذیب میں اور میدانی علاقوں کی تہذیب میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ چناں چہ عربوں کی تہذیب ہم سے مختلف ہے تواس کا بڑا سبب یہ ہے کہ عربوں کے طبعی حالات ہم سے مختلف ہیں۔ کچھ مفکرین نے انسانی ذہن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تشکیل پانے والے آلات واوزار کو انسانی تہذیب کی تشکیل اور تبدیلی کا ایک اہم ترین عنصر قرار دیتے ہیں۔ تہذیب کی عمارت کا مدار آلات واوزار پر ہے اور انسانی تہذیب کی ترقی اوزار پر منحصر ہوتی ہے۔

آلات کی ایجاد کے بعد انسانی تہذیب نے بڑی تیزی سے اپنی شکلیں بدلی ہیں جتنی تیزی سے نئے نئے علوم خصوصاً سائنس و ٹیکنالوجی متعارف ہوئی ویسے ویسے انسانی سوچ کے زاویے اور نظریے بدلتے چلے گئے، فاصلے کم ہوتے چلے گئے۔ علم وفکر میں وسعت آتی گئی۔انسانی اقدار بدلیں تو رہن سہن کے انداز میں فرق آتا گیا۔ یہ تمام تبدیلیاں تہذیب پر اثر انداز ہوتی رہیں اور تہذیب کے رنگ بدلتے چلے گئے۔جوں جوں انسانی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوتی گئیں اور اس کے وسائل میں اضافہ ہونے کے ساتھ تہذیب بھی اپنی شکل بدلتی رہی۔ نئے آلات واوزار نے نئی روایات واقدار کو جنم دیا۔ ہنر اور پیشوں میں جدت آتی چلی گئی طبقے بنے، قانون کے اصول وضع ہوئے نیز قواعد و ضوابط کے ڈھانچوں میں تبدیلیاں آتی رہیں۔

جب پورے معاشرے کے طرز عمل میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ایک نئے تہذیبی ڈھانچے نے اپنا رنگ دکھایا جو کہ دراصل اگلی منزل کی جانب ایک قدم تھا۔ماہرین تہذیب کے سفر میں دھات اور اوزار کی ایجاد کو تہذیبی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ قرار دیتے ہیں۔ جب بربری نے قدم باقدم آگے بڑھتے ہوئے زمینی دھاتیں دریافت کیں اور انہیں پگھلا کر ڈھالنا سیکھا جب اس نے کانسی بنائی کچی دھات سے لوہا بنایا تو تہذیب کی خاطر ۹۰ فیصد جنگ جیت لی گئی۔ لوہے کے دستے دار اور نوک دار ہتھیاروں سے لیس نوع انسانی کو تہذیب حاصل کرنے کا یقین ہو گیا تھا لوہے کی پیداوار انسانی تجربے کا عظیم ترین اور لاثانی واقعہ تھا۔ باقی کی تمام ایجادات اسی کی مرہون منت تھیں۔۔۔۔۔۔۔

معاشرے کی تہذیبی ترقی اور ارتقا کا انحصار بڑی حد تک اس کے سماج اور اخلاق واقدار سے ہوتا ہے اور اگر ان قدروں کو نظر انداز کر دیا جائے یا ان سے غفلت برتی جائے تو کسی معاشرے تہذیبی زندگی جمود کا شکار ہو جائے گی کیوں کہ ان سماجی اور اخلاقی اقدار پر ہی کسی معاشرے کی تہذیبی زندگی کی بنیاد ہوتی ہے۔ معاشرے کی سماجی اقدار میں

اس معاشرے کے افراد میں باہمی روابط اور تمام فنون شامل ہوتے ہیں۔ معاشرے میں موجود اقدار اس کی شناخت کا حصہ ہوتی ہیں اور معاشرے کے ہر فرد پر ان کی پابندی لازم ہوتی ہے اور ان کی خلاف ورزی کرنے پر معاشرہ رد عمل کا اظہار بھی کرتا ہے۔

سماجی اقدار میں مخصوص معاشرے کی انفرادی خصوصیات بھی شامل ہوتی ہیں کیوں کہ ہر معاشرے میں سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی، جغرافیائی عوامل مختلف ہوتے ہیں اور انہی کی بنیاد پر سماجی اقدار کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ کوئی دوسرا معاشرہ یکساں اقدار کی پیروی کرے۔ سماجی اقدار کسی معاشرے کے انفرادیت ہوتی ہیں لیکن بعض تہذیبی قدریں مشترکہ انسانی یا جغرافیائی یا فطری ضرورتوں کے باعث مشترکہ بھی ہوتی ہیں۔ بعض سماجی قدریں اپنے عہد کی قریب قریب سبھی تہذیبوں میں مشترک ہوتی ہیں۔

ان سماجی اقدار کو اخلاق اور معاشرتی ضرورت و اہمیت کے باعث تہذیب کا ایک اہم ماخذ تسلیم کیا جاتا ہے جس طرح تہذیب کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کب اور کہاں وجود میں آئی اس طرح حتمی طور پر تہذیب کی تشکیل کے عناصر کو بیان کرنا بھی ناممکن ہے لیکن اس کے نمایاں تشکیلی پہلوؤں کا جائزہ ضرور لیا جاسکتا ہے۔ ان اہم عناصر میں رسم و رواج، عقائد، روایات، جغرافیہ، زبان، تاریخ، سیاست اور معاشی نظام بہت واضح اہمیت رکھتے ہیں ان تمام عناصر کو نظرانداز کر کے تہذیب کی تشکیل کے سفر کو سمجھنا ایک ناممکن امر ہے۔

روایات، اخلاقی معیارات، ثقافتی اقدار، روایات قدیم، مستقل عقائد، رسوم، رواج، عادت یا سماجی رویوں کے اس مجموعے کا نام ہے جو بغیر کسی تعطل کے نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں اور انھیں عوامی مقبولیت اور پذیرائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ روایت کی اہم ترین خوبی ان کا تسلسل ہے وہ روایات، عادات یا رویے جو کسی ایک نسل تک محدود رہ کر ختم ہو جاتے ہیں اور وقت کا مقابلہ کر کے زندہ نہ رہ سکیں انھیں روایات میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ان تمام عوامل کے ساتھ ہماری جذباتی، مذہبی، احساساتی یا روایتی ترجیحات، مادی اور سماجی ادارے اور تصورات کی نسل در نسل ترسیل، روایت کی تشکیل کا ایک اہم عنصر ہے۔

زندگی کی ابتدا سے لے کر آج تک جتنی بھی انسانی تہذیبیں گزری ہیں ان میں روایت ایک اہم عنصر ہے۔ اس لیے کسی بھی انسانی تہذیب کا روایات کے بغیر ہونا یا تصور کرنا ہی محال ہے۔ روایات کی جڑیں عوام کے اندر بہت مضبوط ہوتی ہیں۔ کیوں کہ یہ انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہے اور فرد کو اس کی انفرادی ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے سماجی روابط اور رویے کو بھی طے کرنے میں بہت مددگار ہوتی ہے۔ روایات افراد کو ایک مضبوط تعلق دیتی ہیں جو کہ کسی سماجی ڈھانچے یا مثبت ترقی کے لیے بہت اہم ہے۔

روایات کو ضرورت کے مطابق تبدیل کیا جاسکتا ہے لیکن یہ تبدیلی بڑی حد تک ناگوار تصور کی جاتی ہے۔ان تبدیلیوں کو کبھی روایات کے پس منظر کے طور پر بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔اس لیے مضبوط اور کامیاب معاشروں کے لیے مضبوط روایاتی بنیادوں کا ہونا بہت اہمیت رکھتا ہے۔کچھ مفکرین افراد کی روایات کے ساتھ جذباتی اور خصوصاً تاریخی وابستگی کو تسلیم نہیں کرتے ان مفکرین کے نزدیک روایات کی نوعیت عارضی اور ان کی بنیادیں غیر مستحکم ہوتی ہیں۔ ان کی تشکیل صرف عوامی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہوتی ہے اور ضرورت کی تکمیل کے ساتھ ہی روایت کی اہمیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔روایات اور قدریں خاص حالات میں وقت کی ضرورت پوری کرنے کے لیے پیدا ہوتی ہیں اور جب ان کی افادیت ختم ہو جاتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ان کا وجود بھی ختم ہو جاتا ہے۔یہ ضرور ہے کہ ہر قوم اپنی روایات کی بقا کے لیے جدوجہد کرتی ہے اور اپنی بقا کے لیے ہی وہ اپنی بنیادی ہئیت میں تبدیلی لاتی ہے نئے نظریات کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے تاکہ وہ نئے خطرات اور چیلنجوں کا مقابلہ کر سکے۔

قدامت کو عموماً روایات کے لیے بہت لازمی عنصر مانا جاتا ہے۔اس طرح یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ روایت ناقابل تبدیل ہوتی ہے خصوصاً مذہبی روایت کے بارے میں تو یہ سوچا بھی نہیں جاتا کہ ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔لوگ اپنے عقائد کی بنیاد پر اندھادھند اعتماد اور ان روایات کی تقلید کرتے چلے جاتے ہیں۔فرد ادارے اور جماعتیں اپنے ذاتی، گروہی اور قومی مفادات کے اصول یا اپنی مراعات کو برقرار رکھنے کی خاطر روایات کی تشکیل و تعمیر میں حصہ لیتے ہیں۔ان روایات میں شخصیت پرستی، تہوار، تقریبات اور رسم و رواج شامل ہوتے ہیں۔

وہ تمام روایات جو کسی معاشرے کے عقائد یا تاریخ سے متصادم ہوں انہیں نا تو معاشرہ قبول کرتا ہے اور نا ہی ان کی پذیرائی ہوتی ہے اس لیے وہ روایت جلد اپنی مقبولیت اور وجود کھو بیٹھتی ہیں۔ہمارے ہاں روایت کا ایک تصور یہ ہے کہ یہ ماضی سے منسلک ہوتی ہے اسے رجعت پسندی یا ماضی پسندی کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔گروہ اپنی ضروریات، نظریات اور عقائد کی روشنی میں اپنی روایات کی تشکیل کرتا ہے جو رفتہ رفتہ اس کی انفرادی پہچان بن جاتے ہیں۔یہی انفرادیت گروہ یا خطے کی پہچان بن جاتی ہے۔اس وجہ سے تہذیبی سطح پر قومیں زندہ رہتی ہیں وہ اقوام جو اپنی تہذیبی و روایاتی شناخت اور اس حیثیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں بہت جلد دوسری اقوام کی تہذیب و روایات میں کھو کر اپنی انفرادی حیثیت کھو بیٹھتی ہیں۔اس لیے بلاواسطہ طور پر ہی یہ روایات ہماری آزادی ہماری تہذیبی و ثقافتی شناخت اور حیثیت کی ضامن ہوتی ہیں۔

روایات کسی قوم کا اثاثہ اور اس کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہوتی ہیں۔اکثر یہ تاریخ کے ان حقائق سے بھی پردہ اٹھاتی ہیں جو وقت کی راکھ میں دب کر اپنی شناخت کھو چکے ہوتے ہیں۔۔یہ روایات افراد کا رشتہ ان کی تاریخ سے بنائے

رکھتی ہیں اور انہیں اپنی پہچان سے جوڑے رکھتی ہیں۔ ان روایات کی شکل میں ماضی سے ہمارا رشتہ کسی نہ کسی صورت میں پیوستہ رہتا ہے اس لیے بعض ماہرین روایت پسندی کو ماضی پرستی یا رجعت پسندی کہہ کر بالکل رد کر دیتے ہیں۔

ایک جانب تو روایت کو کسی قوم کی پہچان اور اس کی آزادی کی قیمت مان کر اسے اپنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو دوسری جانب روایت پسندی کو ماضی پرستی اور رجعت پسندی قرار دے کر ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ ان متضاد صورتوں نے معاشرے میں ایک بے چینی کی فضا کو پیدا کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی دو مختلف نظریات کو فروغ حاصل ہوا ہے جس نے ہمارے ذہنی، جذباتی نظریات اور رشتوں میں انتشار کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

روایات کی تشکیل مذہب کی بنیاد پر ہو تو تاریخ اور جغرافیائی عناصر کی بنیاد پر ان تمام روایات کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ معاشرے میں افراد کی بڑھت اور دوسرے عناصر کے ساتھ ان کے تعلق کو طے میں روایات اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جدت یا ماضی پرستی دو انتہائیں ہیں اور ان دونوں کے درمیان روایت نہ صرف یہ کہ ایک خوب صورت اور مضبوط سماجی رشتہ ہے بلکہ یہ افراد کے باہمی تعلق کو ایک کشش بھی عطا کرتی ہے۔

تہذیب کا ایک بنیادی عنصر اقدار ہیں ہر معاشرے کی کچھ ذاتی، انفرادی اور اجتماعی قدریں ہوتی ہیں جن کے مطابق اس معاشرے کے افراد اپنے تصور زندگی کا یقین کرتے ہیں۔ افراد کے کسی گروہ کے مشترکہ عقائد نظریات ضروریات کی بنیاد پر طے پانے والی ترجیحات، باہمی روابط، اخلاقیات، عادت، طرز زندگی اور فنون لطیف کے مہارت کسی معاشرے کی اقدار کہلاتی ہیں۔ وہ اقدار معاشرے کے طے شدہ اصول و قواعد، افراد کے رویوں، رہن سہن، رسم و رواج اور زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتی ہیں۔ ان اقدار سے بغاوت یا ان کی خلاف ورزی کی صورت میں معاشرہ شدید رد عمل رکھتا ہے اس لیے افراد معاشرہ ان اقدار کو سب سے مقدم و محترم مانتے ہیں۔ ریاض احمد "قدر" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> قدر وہ انفرادی معیار یا نفاذ ہے جس کی سطح تک پہنچنے کی ہم اپنے قول و فعل میں کوشش کرتے ہیں یہ کوشش اور قدر ایک مخصوص دائرے میں عمل کرتی ہے اس طرح منطق کی قدر وصحت، فکر و خیال مذہب کی قدر، معبود حقیقی کی تلاش، اخلاقیات کی قدر، انسانی کردار کا صحیح نظام فلسفہ کی قدر، صداقت کی تلاش، جمالیات اخلاقیات کی قدر، حسن قرار سی جاتی ہے۔[۱۰]

معاشرہ اپنی اقدار کی تشکیل اور تحفظ اس لیے بھی کرتا ہے کہ ان کے ذریعے وہ اپنی ضرورتوں کو زیادہ بہتر طریقے سے پورا کر سکتا ہے۔ بہت سی اقدار ہمارے مذہبی اور اخلاقی احساسات و جذبات کی تسکین کے لیے تشکیل پاتی ہیں اور اس لیے یہ قدریں زیادہ اہمیت اور رسوخ کی حامل ہوتی ہیں۔ اقدار و روایات دراصل ایک سماج کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تاریخی عوامل کی زد ہوتی ہیں۔ پس کسی بھی سماج پر ان اخلاق و روایات کو خود سے لاگو نہیں کیا جا سکتا ہر

سماج اپنے تاریخی تناظر میں اپنی روایات واقدار کو خود ابھار رہا ہوتا ہے۔ یہ اقدار و روایت اس سماج کے مخصوص سماجی، معاشی اور سیاسی نظام کے زیر اثر بتدریج پنپتی رہتی ہیں۔ اقدار تہذیب و تمدن کی وہ بنیاد جن پر تہذیب کی بلند و بالا عمارت قائم ہوتی ہے یہ اقدار ہماری زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہیں۔ اگر انسانی اقدار کی بات کی جائے یا ادب، آرٹ اور کلچر کی قومی، مذہبی یا اخلاقی اقدار کی بات ہو یا عالمی اقدار کی سطح پر یہ اقدار ہمارے لیے ایک مشعل راہ کا کام کرتی ہیں۔ مذہب، اخلاق، قانون، نظم حکومت، فلسفہ جمالیات، جغرافیائی و طبعی عوامل اور معاشی و سماجی حالات سبھی مل کر ایک طرف تو پرانی اقدار کی شکلیں بدلتے ہیں تو دوسری طرف نئی قدروں کو جنم دیتے ہیں۔

اقدار کی تشکیل کا ایک اہم عناصر جغرافیائی و طبعی عوامل ہیں کیوں کہ اقدار کیسی ہی کیوں نہ ہوں ان کی تشکیل اور ان کے مزاج میں اس سرزمین کی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے جس میں ان اقدار نے جنم لیا ہو۔ اقدار کی مخصوص اور امتیازی جہتیں اس کی اپنی سرزمین سے ابھرتی ہیں یعنی مختلف طرح کے جغرافیائی اور طبعی عوامل مختلف طرح کی اقدار کے فروغ کا باعث بنتے ہیں۔ اقدار انسانی اور سماجی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق افراد کے باہم ایک جگہ رہنے اور ایک جیسے نظریات و عقائد اور حالات کے علاوہ انسانی زندگی گزارنے کے طریقوں اور انسانوں کے مابین مخصوص رشتوں کی بنیاد پر جنم لیتی ہیں۔ ان سماجی اقدار کی بنیاد پر انسان اپنے ارد گرد کے ماحول اور ترجیحات کو طے کرتا اور زندگی بسر کرتا ہے۔

اقدار کی تشکیل کا ایک بڑا عنصر تغیرات بھی ہیں جن کے باعث اقدار بنتی اور بگڑتی ہیں۔ قدروں کے ٹکراؤ کے نتیجے میں ان کے بننے اور ٹوٹ پھوٹ یا ارتقا کے عمل سے جہاں ایک طرف موجود قدریں اپنی شکل بدلتی ہیں وہیں نئی اقدار بھی تشکیل پاتی ہیں لیکن ان سب کے باوجود بعض اقدار اپنی اصل صورت میں بھی موجود رہتی ہیں۔ قدریں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں لیکن زندگی کے ہر دور میں بعض قدریں ایسی ہوتی ہیں جن کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور ان کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔

نئی اقدار کی تشکیل پرانی اقدار کی بنائی بنیادوں پر ہوتی ہے کیوں کہ نئی اقدار ہوا میں معلق نہیں ہوتیں۔ پرانی اقدار نئی اقدار کو جنم دیتی ہیں وران کی پرورش کرتی ہیں۔ تہذیب اقدار کے اسی تسلسل کا نام ہے اور سماج اپنی اقدار کی بنیاد پر فروغ پاتا ہے۔ اقدار کی تشکیل میں مذہب ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے عقائد کی بنیاد پر فلسفے اور نظریات زندگی تشکیل پاتے ہیں جو ہمارے تعلقات اور سماج کی بنیاد ہوتے ہیں۔ مذہب ہی وہ عنصر ہے جو معاشرے کی اقدار کا کسی حد تک تعین بھی کر رہا ہوتا ہے۔ انسان کے لیے مذہب سے دامن چھڑانا مشکل ہے۔ یہ زمانے، خطے اور قوم کی اقدار ان کی ضروریات اور تقاضوں کی روشنی میں طے ہوتی ہیں۔ اسی لیے مختلف قوموں کے اقدار میں تنوع پایا جاتا ہے

لیکن بعض اقدار ایسی ہوتی ہیں جن کو آفاقی کہنا زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ وہ قدریں ہیں جن کو ہر سماج اپناتا ہے اور یہ اپنے عہد کی تمام تہذیبوں میں پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین درویش اپنے مضمون انسان ، کائنات اور سماج میں اس کی وضاحت کرتے ہیں:

> قدریں کسی سماج کی مجموعی کارکردگی کا نتیجہ ہوتی ہیں اور ان کو اوپر سے مسلط نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایک معاشرہ جہاں انسانی، سماجی اور مادی وسائل کی تنظیم میں ایک موثر اور بہتر نظام کا عمل دخل نہیں ہوتا وہاں ان اصولوں کا اطلاق بے معنی ہو جاتا ہے۔ جس طرح اچھے سماجی، سیاسی اور معاشی نظام کے نتائج اچھے نکلتے ہیں اور برے نظام کے نتائج برے نکلتے ہیں۔ پس تہذیبی قدریں مسلمات نہیں ہوتیں بلکہ نتائج ہوتی ہیں ہر نوع کا تجزیہ اپنی ہئیت، تربیت اور ترکیب کے مطابق نتیجہ فراہم کرتا ہے۔[11]

اقدار کا الجھاؤ ۲۰ ویں صدی کی ۲ عظیم جنگوں اور ان گنت ایسے ہی واقعات کے باعث انسان کی جذباتی، جغرافیائی، نفسیاتی، اخلاقی اور جمالیاتی تبدیلیاں اور تصادم کے نتیجے میں سامنے آیا۔ اب اقدار کا مسئلہ صرف ارتقائی عمل نہیں رہا بلکہ مادی اور پیداواری رشتے اور جذباتی و نفسیاتی کشمکش بھی اقدار کی تشکیل اور توڑ پھوڑ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ترقی کے اس دور میں نئی صدی کی نئی ترقی اور تبدیلیوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہم نے پچھلی چند باتوں میں تہذیب، ثقافت، کلچر، معاشرہ، سماج اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے مختلف عناصر پر بات کی ہے۔ سب سے اہم بات جو ثقافت کی ذیل میں آتی ہے وہ اقدار رسم ورواج روایات کی صورت میں ہے جیسا کہ ایک سماج میں رہتے ہوئے مختلف چیزیں اپنا سفر جاری رہتی ہیں تہذیبوں اور خصوصاً تہذیبوں کے عناصر میں اختلاف پایا جاتا ہے اور بہت سی مشابہتیں بھی موجود ہوتی ہیں۔

معاشرہ ایک کمیونٹی کی صورت میں ہوتا ہے تو یہاں پر مذہبی تفریق، لسانی تفریق، سماجی تفریق، معاشی تفریق جیسے عوامل کارفرما ہوتے ہیں اقدار اور روایات کسی بھی تہذیب کی بنیادوں میں شامل ہوتے ہیں اور یہیں سے تہذیب اپنے انفرادات تلاش کرتی ہے مثال کے طور پر مشرقی تہذیب کا اختصاص یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ روحانیت پر مبنی ہے جب کہ مغرب کی تہذیب کو مادیت پرست کہا جاتا ہے لیکن یہ بات مکمل طور پر درست نہیں بلکہ جزوی حیثیت کی ہے کیوں کہ مغرب میں بھی ہمیں بہت سے ایسے مفکرین ملتے ہیں جو روحانیت کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔

اختلافات ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور اپنی اختلافات کی بنیاد پر ارتقا کا سلسلہ چلتا رہا ہے اگر معاشرے میں، سماج میں، تہذیب میں یا ثقافت میں اختلاف نہ ہو تو انسان اپنی اصلاح اور اپنے ارتقا کا سفر طے نہیں کر سکتے ہیں۔ اختلاف ایک مثبت چیز ہے اور ہر کسی کا حق بھی ہے۔ اسے جس حد تک ہو سکے فروغ دینا چاہیے۔ جب تہذیبی اختلافات

کی بات کی جاتی ہے تو یہاں اس سے مرد یہ ہوتی ہے کہ ایک تہذیب کے سماج وروایات، ثقافت سے دوسری تہذیب کسی حد تک مختلف ہے اور کون کون سی مشترک قدریں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اگر پاکستانی سماج کی بات کی جائے تو یہاں پر پردہ داری اور عقائد پرستی جیسے عوامل نظر آتے ہیں۔ یہاں پر شخصی آزادی کا حق ذرا منضبط صورت میں موجود ہے جب کہ اگر مغربی سماج کو دیکھا جائے تو وہ اپنے حق آزادی کے اظہار پر مطمئن ہیں اور شخصی آزادی کا حق بھی ان کو حاصل ہے۔اسی وجہ سے مفکرین نے مشرق، مغرب اور شمال و جنوب کی تہذیبوں کے انفرادات واختلافات کو اکٹھا کر کے ان کو مختلف سمتوں کی طرف روشناس کروانے کی کوشش کی ہے۔

تہذیبی اختلافات چھوٹے سے چھوٹے عنصر سے لے کر بڑی سے بڑی قدر تک ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر کھانا، پینا، رہن سہن، چلنا پھرنا، لباس اور محبت، روحانیت، جنگ، سیاسی حکمت عملی یہاں تک کہ تصور خدا، تصور زندگی، تصور موت تک یہ اختلاف چلتے ہیں۔ان میں سے کچھ اختلافات ناول سا سا میں بھی نظر آتے ہیں۔

کسی بھی طرح کا کوئی بھی متن ہو اور خصوصاً اس متن کا تعلق ادبی متون سے ہو جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ایسے متون کے یہاں معنی کی کئی پرتیں نظر آتی ہیں۔ متن اپنی پرتوں میں جھانکنے کی اجازت قاری کو بار بار کی قرأت اور ریاضت کی صورت میں دیتا ہے۔قرأت ہی وہ اولین زینہ ہے جس سے ہم متن کے اندر داخل ہوتے ہیں یا متن میں چھپے معنوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ تہذیبی اختلافات کے حوالے سے جتنی باتیں اس باب میں کہی جا چکی ہیں اس حوالے سے ناول (سا سا) کے متن کو دیکھتے ہوئے اس میں موجود تہذیبی اختلافات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ناول کے آغاز میں ہی کچھ سطور محبت جیسے آفاقی جذبے کی شان میں ملتی ہے جن میں ایک استفہام کا عنصر ہے۔

"کا چاہے؟"
"محبت"
"کا ہے؟"
"مندہ رین کا واسطے"
"کب چاہے؟"
"سانس، سانس پر"
"کسی چاہے؟"
"ہیں قسمیں ہوتیں کا؟" [۱۲]

ان ابتدائی سطور میں محبت کی جانب اشارہ ہے اور اس کے مختلف عناصر کا ذکر ہے کہ محبت مانگی جاتی ہے، محبت دی جاتی ہے، محبت ہو جاتی ہے، یا پھر محبت کے اوپر سوال کیے جاتے ہیں۔ ناول کے سیاق کو بھی ان سطور کے تناظر میں

دیکھا جاسکتا ہے چاہے مشرق ہو یا مغرب، محبت کا سوال اپنی تمام دل فریبیوں کے ساتھ موجود رہتا ہے ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس کے مندرجات بدل جاتے ہیں۔

تہذیبی اختلافات جہاں کلچر و ثقافت کے مباحث کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کرتے ہیں وہیں پر یہ کچھ پیچیدگیاں بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ اگر موجودہ صورت حال میں ہم کسی تہذیبی اختلاف کی بات کریں تو حال احوال الگ نوعیت کا ہو گا جیسا کہ اب ہم اس تہذیبی مسئلہ کو پاکستان کے تناظر میں رکھ کر دیکھیں گے مثلاً اگر اب اسکول یا تعلیمی نظام کی صورت کو دیکھا جائے تو وہ اپنے تہذیبی تناظر کے ساتھ مقامی تناظر کو بھی زیرِ بحث لائے گا۔ ہم جب ناول کے آغاز میں موجود اسکول کی تصویر دیکھتے ہیں جو ناول نگار کی نثر کے کمال کو ثابت کرتے ہیں تو وہ اسکول ہی ایک اہم امتیاز پیدا کر دیتا ہے۔ دو الگ الگ رتیلوں کے درمیان دو الگ تہذیبوں کے درمیان اب تو یوں بھی کیا جاسکتا ہے امیری کی تہذیب، غریبی کی تہذیب، اشرافیہ کی تہذیب، سفید پوشوں کی تہذیب، ایلیٹ کلاس کی تہذیب اور رزیل کلاس کی تہذیب۔

ایک جانب تو وہ بنیادی سوال محبت کے بارے میں ہے جس کا سامنا ہمیں ناول میں کرنا پڑتا ہے اور اس طرح کے چند دوسرے سوالات بھی کچھ بچوں کو تلاش کے لیے دیے جاتے ہیں لیکن اب گر ہم معاشرے میں ذہنی تربیت کو دیکھیں تو ایک طرف وہ نسل ہے جو ٹاٹ پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کر رہی ہے جب کہ دوسری جانب وہ نسل ہے جس کی امنگیں نوم چومسکی سے ملاقات، شور پھاڑی کا سفر، دوسرے دیسوں کی سیر شامل ہے۔ یقیناً دوسری نسل کی ذہنی تربیت اور ابتدائے بچپن کے حالات پہلی نسل سے الگ رہے ہوں گے جب ہی تو امنگوں میں اتنا تضاد ہے لیکن مکمل طور پر ایسا نہیں ہوتا ہے ناول نگار خود اپنے بیانیے میں اس بات کی تردید کرتا ہے۔

منفی امتیاز جو آگے چل کر ایک باقاعدہ رجحان اور تحریک بھی بن جاتا ہے جس کی گواہ پوری تاریخ فکر انسانی ہے جو جمالیاتی معنوں میں تانیثیت کہلاتی ہے۔ یہاں ناول کے سیاق میں کچھ ایسے معاشرے کا احوال ملتا ہے جہاں ہر کسی کو من چاہی زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ ناول نگار ناول کے سیاق میں ہمارے اس بیانیے کو توڑتا ہے جب جینی کے گھر والوں سے سلیم جا کر ملتا ہے اور اس کی ماں سے ملاقات کرتا ہے۔

> مجھے امریکہ آئے تقریباً دس ماہ گزر چکے تھے اور میری طبیعت میں کچھ ٹھہراؤ بھی آ رہا تھا۔ ایم اے انگریزی کے دو سمسٹر ہو چکے تھے۔ اینا مل چکی تھی میرے مضامین پاکستان کے انگریزی اخبارات و جرائد میں چھپنے لگے تھے اور گاڑی تو یہاں پہنچتے ساتھ ہی میں نے لے لی تھی۔ تاہم اب بھی جس کو جی بھر جانا بولتے ہیں نا وہ رجا ہوا احساس نہیں آیا تھا۔ سوا بھی توبہ نہیں کی تھی۔ مجھے وطن کی یاد آتی تو تھی مگر ستاتی نہیں تھی۔ میرا وطن واپس جانے کا من نہیں تھا۔ [۳۱]

انسان کی فطرت کے ضروری عوامل میں سے ایک ہے کہ اس کے کچھ ارمان کچھ خواب ہوتے ہیں جن کے بل بوتے پر یا تو وہ زندگی گزرتا ہے یا ایک منزل کا تعین کرتا ہے اس اقتباس سے ہمیں سلیم اپنے ہی معاشرے کے کسی فرد کی طرح لگتا ہے جو دوسرے دیس بہت سی امیدوں کے ساتھ روانہ ہوتا ہے۔

> یہ خدا میں نے اس طرح کے حسن کی تلاش میں یہاں داخلہ لیا تھا ویزا لیا امریکی سفارت خانے میں ایسی ایسی چیزیں اتار کے گیا کہ جنہیں کبھی مسجد میں بھی اترنے کا نہیں سوچا تھا اپنی مٹی کا منکر بن کر پردیس روانہ ہوا۔ نقل زمین سے بغاوت کر کے کوئی بیس گھنٹے ہزاروں فٹ کی بلندی پر اڑتا رہا۔ شکاگو ایئرپورٹ پر تین گھنٹے الو بنا بیٹھا رہا کہ امریکی سیکورٹی اہلکار یہ طے کر سکیں کہ میں دہشت گرد نہیں ہوں۔ [۱۴]

تہذیب میں اختلاف کب پیدا ہوتا ہے کبھی تو اس کے لیے ایک طویل وقت درکار ہوتا ہے اور کبھی تو بہت قلیل عرصے میں تہذیب اپنے اہداف مقرر کر لیتی ہے ایسی ہی صورت ہمیں ۹/۱۱ کے بعد محسوس ہوتی ہے جب دوست نے اپنے خاص رنگ دکھائے اور پاکستان بحیثیت مجموعی اس تمام صورت حال میں بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا۔ پوری دنیا کے سامنے ہم دہشت گرد بن گئے اور ہمارے امن کے اوصاف دوسروں کی نظروں میں ایک دکھاوا بن کر رہ گئے۔ مندرجہ بالا اقتباس بھی اس پس منظر کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ تہذیبی اختلاف امن ہے یہاں پر کیوں کہ جب امن کو قائم کرنے کی خاطر اور امریکہ جیسے دوست کو خوش کرنے کے لیے ہمیں اپنے ہی لوگوں کے خلاف عسکری آپریشنز کیے تو تہذیبی اختلاف ہمارے معاشرے میں موجود دوستوں کی دوستی اور دوستوں کے دشمنوں کی دوستی جیسی عجیب صورت حال میں سامنے آتا ہے۔ تہذیبی اختلافات بعض اوقات ہم خود پیدا کرتے ہیں اور کئی دفعہ ہماری تہذیب اپنی اقدار کی روشنی میں کچھ اصول و ضوابط بنا لیتی ہے۔ یہیں سے یہ بحث شروع ہوتی ہے کہ تہذیبی اختلافات اور تہذیبی امتیازات میں کیا فرق ہے اور ایک تہذیب دوسری تہذیب کو کن معنوں میں متاثر کر رہی ہوتی ہے۔

تہذیبی اختلاف یا پھر کسی معاشرتی عنصر میں کسی دوسرے ملک کے معاشرتی عنصر میں فرق سے ہم کسی تہذیبی اختلاف کو بیان کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں ناول ساسا میں ہمیں بہت سے ایسے حقائق بھی ملتے جن کو ہم پہلے سے جانتے ہیں بس ناول نگار ان کی طرف اشارہ کر کے ہماری توجہ کا مرکز ٹھہرتا ہے جس طرح سے تعلیمی اداروں پر بات کرتے ہوئے کہا:

> تاہم چاروں بچوں کو ایک خاندان کے حوالے کرنا بھی زیادتی تھی۔ لہذا اس نے اپنے بیٹے بیٹیوں کو اپنے مختلف رشتہ داروں میں ایسے بانٹ دیا، جیسے پاکستان کی حکومت نے اپنے اسکولوں، مدرسوں، یونی ورسٹیوں کو مختلف، رشتہ دار، ممالک کے حوالے کیا ہوا ہے۔ [۱۵]

کسی بھی تہذیب کے عناصر میں معاشرہ ایک واضح تبدیلی اور اہمیت کا حامل ہوتا ہے جسے ناول ساسا میں ہمیں ایک جگہ معاشرتی تقابل نظر آتا ہے:

۔۔۔۔مجھے وہیں لیٹے لیٹے ساسا کے حالات زندگی میں دلچسپی لیتے دیکھ کر اس نے مجھے افسردگی سے بتایا کہ صبح ساسا کی آنکھوں کے کونوں میں میل تھا جس کا مطلب ہے کہ یہ بیمار ہے۔اس پر میں نے جینی کو اپنے گاؤں کے ان بچوں کا بتایا جن کی آنکھوں کے کونے، ناکوں نے نتھنے اور کانوں کی کانیں ہمیشہ میل سے بھری رہتی ہیں۔[۱۶]

ایک جانب جان دار کی جن کی اتنی اہمیت ہے کہ وہ ساسا کی آنکھوں کا میل دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے جب کہ دوسری جانب سلیم کی وہ بٹن ہیں جو مندرجہ بالا اقتباس میں پیش کی گئی ہیں۔جب ساسا کی طبیعت بگڑتی ہے وہ تو صرف ایک پرندہ ہے لیکن اس کے لیے تو ایمبولینس آجاتی ہے جب کہ ہماری ہاں اس کا حل صرف و صرف حلال کرتا ہوتا۔ یہاں تو تہذیبی زوال اس حد تک ہے کہ ایک انسان کی جان بھی اپنا تقدم قائم نہ کر سکی۔

کولوراڈو یونیورسٹی کے خلائی ٹیکنالوجی کے پیج پر یہ خبر تھی کہ ڈیپارٹمنٹ نے مریخ پر مصنوعی سیارہ بھیجنے اور وہاں کی مٹی کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک ملٹی بلین ڈالر کا میگا پراجکٹ حاصل کر لیا ہے۔[۱۷]

تعلیمی ادارے اور تعلیم نظام کسی بھی تہذیب کے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہیں سو کولوراڈو یونیورسٹی کا صرف مٹی کے معائنے کے لیے ایک خطیر رقم خرچ کرنا دوسری جانب ہماری تہذیب میں تعلیم ایک ثانوی سرگرمی کا درجہ حاصل کرتی جا رہی ہے۔عورت کے بے شمار روپ ہیں۔کس شکل میں وہ کسی مخالف صنف کو اپنا گرویدہ بنالے اس کا فیصلہ دونوں کے اختیار میں نہیں ہوتا۔اس لیے ناول نگار امریکہ کا نمائندہ بن کر اینا کے کردار کو پیش کرتا ہے دوسری جانب جینی میں اسے مشرقی مزاج نظر آتا ہے۔انسان کچھ اصول و قوانین پر عمل پیرا ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جوں جوں وہ بلوغت کی منازل طے کرتا ہے کچھ ذاتی اصول اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں اس طرح کا معاملہ سلیم کے ساتھ پیش آتا ہے جس کی عکاسی یہ اقتباس کرتا ہے:

۔۔۔۔یہی تو وجہ تھی کہ مجھے پہلی بار ایک منزل بھی دس ہزار میل دور جا کر نصیب ہوئی اور کیا اس روز میں اینا سے کچھ دور ٹھہر نا گیا تھا؟ اگرچہ اینا اسے میرا شوق حجاب تصور کرتی تھی مگر دراصل یہ احترام محبت تھا۔یوں محبت کو بن چادر کے جا لینا ہماری روایت نہ تھی محب کے اس اہتمام کی لاج محبوب پیش ہو کٹ رہنا ہوتی ہے ایسا ہی تو ہوا تھا سب کچھ۔[۱۸]

ہم تہذیبی اختلافات بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ناول میں نہ خود اس طرح کے معاملات مل جاتے ہیں جو یہ وضاحت کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں جس طرح کہ مندرجہ بالا اقتباس میں ایک بڑے تہذیبی اختلاف کو بیان کیا گیا ہے جو ایک خاص حد تک مشرق کو مغرب کے مزاج سے الگ کرتا ہے۔

> محبت، میں نے سوچا، عجیب گتھی ہو تم، جسے سلجھانے کے لیے میں دس ہزار میل یہاں آیا ہوں اور جینی تمہارے پیچھے وہاں جانا چاہتی ہے ۔۔۔وہاں، جہاں میں نے نفرتوں کی تبلیغ سنی تھی اور محبتوں پر پابندیاں دیکھی تھیں۔ جہاں لوگ فاختاؤں کی جگہ عبادت گاہیں اڑنے والے دور میں جا پہنچے تھے۔ جہاں مسلمان تو ایک کو بھی نہ کیا گیا مگر کافر و مشرک سب کو کر ڈالا گیا۔[۹۱]

یہ معاشرہ نہ تو مستقل طور پر عروج پر رہتا ہے نہ ہی ہمیشہ زوال کے دلدل میں پڑا رہتا ہے۔ اسے اچھے اور برے دنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب جینی پاکستان کے متعلق سہانے خواب دیکھتی ہے تو سلیم کے دماغ میں وہ تمام بیانیہ گھومنے لگ جاتا ہے جس ڈگر پر آج کل ہمارا وطن چل رہا ہے۔ حالات پہلے سے ایسے تھے اور ایک امید ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اب اگر ہم حالت حاضرہ میں امریکہ کی سماجی صورت کو دیکھیں تو معاشرتی نوعیت کے تغیرات کی وجہ سمجھ آ جائے گی۔ جب ہم واپس ہاسٹل کو آ رہے تھے تو میں نے جینی سے کہا کہ اس کے والد بہت دلچسپ آدمی ہیں اور ان کی حس مزاح متاثر کن ہے۔ جینی نے مجھے دیکھا اور ہنس کر کہا کہ یہ حس مزاح ہی تو ہے کہ ممی ابھی تک ان کے پاس ہیں۔ ورنہ وہ تو لیزبین ہیں اور مستقل اپنی گرل فرینڈز کو ڈیٹ کرتی ہیں۔

لیزبین ازم ایک وصال کا غیر فطری طریقہ ہے لیکن اس کے عناصر و شواہد کافی پہلے سے موجود ہیں اب جا کر اس نے باقاعدہ ایک رجحان کا درجہ حاصل کر لیا ہے اس کی عمومی طور پر دو صورتیں ہیں پہلی صورت خود لذتی کے زمرے میں آتی ہے جب کہ دوسری صورت میں جنس مخالف کی غیر موجودگی میں ہم جنس کے ساتھ مل کر لذت حاصل کرنا۔ اب اس طرح ہم امریکی معاشرے اور پاکستانی معاشرے کو دیکھیں تو زمین آسمان کے فرق جیسے محاورے کا استعمال کرنا پڑتا ہے بولڈ ماحول میں پرورش نے جینی کو اس قابل کیا کہ وہ یہ بات آرام سے کر سکتی ہے جب کہ سلیم ایک مرد ہوتے ہوئے بھی اس بات پر چونک پڑتا ہے۔ یہی صورت آگے جا کر اس حقیقت کو بھی واضح کرتی ہے کہ ان معاشروں کے لوگ تابوس سے الگ الگ سطح پر نبرز آزما ہوتے ہیں۔

ایک طرف تو جینی کی ماں ٹھہری اسے ہم امریکہ کی سرزمین کا رجحان کہہ سکتے ہیں لیکن جب ناول نگار سلیم کے دوست عامر کی ایشوریا کے ساتھ شادی جو کہ ایک خواجہ سرا ہے کی روداد بیان کرتا ہے اور آخر کار شادی ہو جاتی ہے تو یہاں اب مشرق کی روایت کو قصور وار ٹھہرایا جائے یا ذاتی خواہش؟ اور کیا قصور وار ٹھہرانا ضروری ہے؟ اس سے زیادہ

ضروری عنصر یہ ہے کہ عامر کس حالت کو پہنچا جب اس کی ایشوریا ایک دھماکے کی نظر ہو گئی اور عامر مجذوب کی حالت میں گھومتا اور دھمال ڈالتا پھرتا ہے۔

میرے لیے ایک دن جینی ناشتہ بنانے گئی تو میں اس آؤ بھگت پر غور کرنے لگا۔ امریکی ایڑوں سے اس طرح کے سگھڑ رویے کی کبھی کسی نے توقع بھی نہیں کی ہو گی۔ [۲۰]

(عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف ہمیں امریکیوں کی مہمان نوازی کی تعریف سننے کو ملتی ہے جب کہ دوسری جانب ان کو ایڑوں کا تصب دیا جا رہا ہے) ہمارا یہ خیال ہے کہ نا تو امریکیوں کو مہمان نواز کہنا درست ہے اور نہ ہی ایڑ کہا جا سکتا ہے معاشرہ ایک مجموعہ ہوتا ہے جس میں ہر رنگ، ڈھنگ، نسل، فطرت کا شخص موجود ہوتا ہے۔

خدا کے ساتھ انسان کا رشتہ ایک بھروسے اور دلاسے کا بھی ہوتا ہے اور مذہب وعقیدہ کی طریقے سے انسان کے اندر تک پیوست ہوتا ہے۔ اس کا انداز ناول کے سیاق میں رہتے ہوئے ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب سلیم جیسا بولڈ، ترقی یافتہ اور عقلیت پرست شہر میں بیٹھ کر خود کو اکیلا محسوس کرتا ہے اور تسبیح کرتا ہے۔ تہذیبی اختلاف چھوٹے سے چھوٹا بھی ہو سکتا ہے جس کا تعلق مخصوص لوگوں کی زندگی سے ہو اور بڑے سے بڑا بھی ہو سکتا ہے جو انسان کے تصورات پر بنیاد رکھتا ہو۔۔۔۔ میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے لگا اور میڈی کو جانوروں اور مرغیوں کو ذبح کرنے کا صحیح طریقہ بھی بتانے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ مرغی کو اگر ذبح کرنے کی بجائے سر پر ہتھوڑا مار کر چھیل لیا جائے، جیسے یہاں ہوتا ہے تو اس کا گوشت خون کی آلائش سے پاک نہیں ہوتا۔ اسی لیے بہت سی ذہنی وجسمانی بیماریوں کا موجب بنتا ہے۔ ایک پرندے کی موت کیا اہمیت رکھتی ہے؟ اس سے کہیں زیادہ غم تو انسان کی موت کا ہوتا ہے پرندہ جتنا بھی عزیز از جان کیوں نہ ہو وہ انسانیت کی قدر کا رتبہ حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ یہی معاملہ سلیم کے ساتھ پیش آتا ہے:

۔۔۔۔ میں تو اس دن بھی یونیورسٹی گیا تھا جس دن سادہ مرا تھا۔ مجھے لگا مجھ سے یہ سوال جینی نہیں اٹھارہ سو کروڑ پاکستانی پوچھ رہے ہیں۔۔۔ ساسا کو دفنانے جانا ہے ہم کیسے یونیورسٹی جا سکتے ہیں؟۔۔۔۔ [۲۱]

اس اقتباس کی مزید وضاحت ہمیں اس مندرجہ ذیل اقتباس میں ملتی ہے:

اس روز مجھے ایک تفاوت نے رلایا۔ ساسا کی موت والے دن میرے سامنے دو دنیاؤں کا بھیانک فرق اس قدر کھل کر سامنے آیا کہ میں اپنے آنسو سنبھال نہیں پایا یہ رونا جذبات کا نہیں ریاضت کا تھا۔ مجھے تقسیم کی تلوار سے گھائل کیا تھا۔ جس لمحے تیسری دنیا کے ہزاروں بچے بے گور و کفن اپنے اپنے حشرات الارض کے انتظار میں گل رہے تھے اس وقت میں آپ کی دنیا کے ایک پرندے کی قبر پر گرم گرم مٹی ڈال رہا تھا تا کہ وہ بعد از مرگ سردی سے محفوظ رہے مجھے معاف کیجیے گا مگر میں ساسا کی موت پر کبھی

نہیں رویا اور نہ ہی ان بچوں کی موت پر جن کے جسم بم کے زیر اثر روئی کے ریشوں کی مانند ہوا میں
بکھرے تو پھر کبھی نہ جڑ پائے۔ میں تو نصیب پر رویا تھا۔ [۲۲]

ناول ایک صورت میں متن ہوتا ہے اور متن کے بہت سے حوالوں سے قرات کی جا سکتی ہے کوئی بنیادی تھیوری کے تناظر میں پرکھا جا سکتا ہے۔ اول میں بہت سے تہذیبی اختلاف موجود ہیں جن کو ہم نے قدرے مختصر انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے بہت سے عوامل اس وجہ سے بحث میں شامل نہیں کیے کیوں کہ ان میں اختلافی پہلو تو موجود تھا لیکن وہ اختلاف بین الوطن، معاشرتی، سماجی سطح پر تھا اس کو باقاعدہ تہذیبی اختلاف کے زمرے میں نہیں لیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مقالات سر سید، جلد چہارم (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۶ء)، ص ۳۔
۲۔ سلیم اختر، کلچر ادب (لاہور: مکتبہ عالیہ، س ن)، ص ۲۰۰۔
۳۔ نوشی انجم، مرتبہ سوال یہ ہے؟ (ملتان: بیکن بوکس، ۲۰۰۴ء)، ص ۴۵۹۔
۴۔ عابد حسین، قومی تہذیب کا مسئلہ (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء)، ص ۹۔
۵۔ غلام جیلانی برق، ہماری عظیم تہذیب (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۱ء)، ص ۱۹۔
۶۔ صلاح الدین درویش، تیسری دنیا کا فلسفہ انکار (لاہور: تخلیقات پبلشرز، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۳۳۔
۷۔ محمد صلاح الدین، بنیادی حقوق (لاہور: ادارہ ترجمان القران، ۱۹۷۸ء)، ص ۲۱۔
۸۔ محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور (اسلام آباد: پورپ اکادمی، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۳۔
۹۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۲۔
۱۰۔ نوشی انجم، مرتبہ سوال یہ ہے؟، ص ۱۲۸۔
۱۱۔ قاسم یعقوب، مدیر، ماہنامہ نقاط (شمارہ اگست ۲۰۰۷ء)، ص ۶۷۔
۱۲۔ شیر ازدستی، ڈاکٹر، ساسا (لاہور: عکس پبلیکیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۲۔
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۲۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۳۶۔
۱۶۔ ایضاً، ص ۳۹۔
۱۷۔ ایضاً، ص ۵۵۔
۱۸۔ ایضاً، ص ۶۸۔
۱۹۔ ایضاً، ص ۹۱۔
۲۰۔ ایضاً، ص ۱۲۲۔
۲۱۔ ایضاً، ص ۱۴۴۔
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۴۹۔

باب سوم:

ناول ساسا میں تہذیبی اختلافات ثقافتی تناظر میں

باب سوم:

ناول ساسا میں تہذیبی اختلافات ثقافتی تناظر میں

ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے اس کا مادہ ث ق ف جس کا مطلب زہر کی دانائی ہے۔ عربی لغت میں ثقف زیرک اور دانا شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تہذیب بھی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی درخت کاٹنے اور تراشنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ گویا لفظ ثقافت کا مفہوم ذہنی و فطری صلاحیتوں پر مشتمل ہے اور تہذیب کا لفظ انداز و اطوار کی شائستگی اور پاکیزگی کو ظاہر کرتا ہے اس طرح دونوں الفاظ مل کر ایک ایسے انسان کا تصور پیش کرتے ہیں جو آداب معاشرت کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کو بھی زندگی کا بنیادی محور سمجھتا ہو۔ اس سے مراد ایسا کامل معاشرہ ہوگا جو رہن سہن کے ساتھ ساتھ علوم و فنون میں بھی ترقی و مہارت رکھتا ہوگا۔ تہذیب و ثقافت گو کہ الگ الگ معنی کی صورت میں مستعمل ہوتے ہیں مگر ان کو یکجا کر کے ایک لفظ کلچر کے ذریعے بیان کرنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی (پاکستانی کلچر) میں لکھتے ہیں:

> میں نے لفظ ثقافت اور تہذیب کے معنوں کو یکجا کر کے ان کے لیے ایک لفظ کلچر کا استعمال کیا ہے جس میں تہذیب و ثقافت دونوں کے مفاہیم شامل ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کو خواہ وہ ذہنی ہوں یا مساوی خارجی ہوں یا داخلی احاطہ کر لیتا ہے۔[1]

اردو میں بیش تر اصطلاحات انگریزی ادب سے آئی ہیں اب ہم کلچر کے لفظ کو ثقافت اور تہذیب کے متبادل رکھ کر دیکھیں تو کلچر خود ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی باقاعدہ اور واضح تعریف موجود ہے۔ کلچر کا لغوی مفہوم تو کاشت کرنا ہے لیکن اس سے ترقی، نشو نما اور تربیت کا مفہوم لیا جاتا ہے لیکن یہ ترقی صرف انسان تک محدود نہیں رہتی ہے بلکہ اس کا اطلاق پورے معاشرے پر ہوتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی شے میں ترقی کی کوئی بھی سوچی سمجھی کاوش کلچر کہلاتی ہے۔ کلچر کا لفظ صرف ایک تعریف بن کر نہیں رہا بلکہ مغرب کے ہاں اس کی اشکال تبدیل بھی ہوتی رہی ہیں یہاں تک کہ ۱۸ویں صدی کے آنے تک مغربی مفکرین اسے زیادہ معین معنوں میں استعمال کرنے لگے۔ ان کی نظر میں اس سے مراد دل و دماغ اور ذوق و نظر کی تربیت تھی۔[2]

آکسفورڈ کے مطابق کلچر میں انسان کی مادی، ذہنی اور علمی ترقی کا وسیع تر مفہوم پایا جاتا ہے کلچر کا مفہوم ثقافت کے بہت قریب ہے اور اگر ان تینوں بنیادی عناصر (کلچر، ثقافت، تہذیب) کی بنیادی تعریفوں کو متعین کیا جائے تو یہ تینوں بڑی حد تک ایک دوسرے کی مترادف ہوں گی۔

الفاظ کی معنیاتی وسعتوں کی تقسیم کے لیے لغت کے دائرے سے باہر نکلنا ضروری ہو جاتا ہے البتہ تہذیب، ثقافت اور کلچر کے معنی کی لغوی بحث سے دو باتوں کا تعین ضرور ہو جاتا ہے۔ایک تو یہ کہ سب ان الفاظ کے ابتدائی مفاہیم ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں نمایاں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔دوسری اہم بات جو ان لغوی مباحث سے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں تہذیب وتربیت اور اکتساب و تحصیل کا تعلق فرد کے اعمال ہی سے ہے۔

ای۔بی۔ٹیلر (E.B.Tylor) نے کلچر کے لفظ کو ایک باقاعدہ اصطلاحی مفہوم دیا اور اس کے وہ معنی متعین کرنے کی کوشش کی جو آج بھی (Anthropology) میں استعمال ہو رہے ہیں۔ٹیلر نے اس لفظ کو فرد سے ہٹا کر معاشرے پر محیط کر دیا ہے۔کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ٹیلر وہ پہلا شخص تھا جس نے کلچر کی تعریف میں واضح اور جامع تبدیلی لائی۔ٹیلر اپنی مشہور کتاب *Promitive Culture* میں کہتا ہے ثقافت علوم و فنون، عقائد، رسوم، اخلاقیات، قوانین، عادت واطوار پر مشتمل وہ اسلوب ہوتا ہے جس کا اکتساب انسانی معاشرے کے فرد کی حیثیت سے ہوتا ہے۔[۳]

Clyde Kluck hotn نے اپنے مضمون *Concept of Culture* میں ثقافت کے حوالے سے کہا ہے کہ یہ وہ نظام حیات ہے جو ایک گروپ کے لوگوں میں نظام اقدار کی شکل میں مشترک طور پر موجود ہوتا ہے۔[۴]

ایک اہم تعریف فلیپ ہگ بائی کی بھی ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ثقافت کسی اجماع کے بیش تر افراد کے ان متواتر رویوں کا نام ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے نسلی اور جبلی نہیں ہوتے بلکہ کسی اجتماع نے خاص ماحول میں مخصوص عقائد، افکار اور دوسرے اثرات کے تحت اپنے اندر پیدا کر لیے ہوتے ہیں۔ان میں یک رنگی پائی جاتی ہے۔مانوسکی کے مطابق ثقافت: ایک مربوط اکائی ہے جس میں اوزار، ہتھیار، صارفین کی کل اشیاء، انسانی افکار، عقائد و رسم ورواج شامل ہیں۔[۵]

انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز (Encyclopedia of Social Sciences) کے مقالہ نگار کے مطابق: ثقافت مرکب ہے معاشرتی وراثت کے طور پر ملنے والے فنون اشیاء تکنیکی عمل عقائد تصورات، عادات واطوار کا۔[۶]

مانوسکی اور کروبر کی تعریفوں کے مطالعے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اصول تشکیل کے ساتھ ساتھ ثقافت کے خارجی مظاہر پر بھی محیط ہے اور یوں اس کی دو اہم ترین جہات کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ان میں سے پہلی جہت تو اصول تشکیل کی ہے اور دوسری جہت اس تخلیقی مغلیت کی ہے جو اصول اور مادی خارجی مواد کی جدلیات میں با

معنی مظاہر کی تخلیق کرتی ہے۔ ثقافت کا سارا تانا بانا چاہے وہ معاشرے کی کسی ابتدائی صورت سے ربط رکھتا ہو یا انتہا درجے کی پیچیدہ ترقی یافتہ سوسائٹی سے متعلق، نہ تو مکمل طور پر مادی ہوتا ہے اور نہ مکمل روحانی ہوتا ہے بلکہ قدرے مادی، قدرے جذباتی، قدرے روحانی امتزاج سے ہی ظہور میں آتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہ تو اصول مجرد ثقافت کہلائے جا سکتے ہیں اور نہ ہی خارجی عمل مقصود بالذات ہوتے ہیں۔ بلکہ ان دونوں کے اتصال سے جو حد نافذ ہوتی ہے ثقافتی مظہر کہلاتی ہے۔ یہ فطرت کے سیاق و سباق میں اعمال انسانیت کے ذریعے تغیرات و تبدیلیوں کا عمل ہے مانو سکی ثقافت کو حیاتیاتی عمل قرار دیتا ہے۔ انسان کو زندہ رہنے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ایک ماحول بنانا پڑتا ہے۔ اس ماحول کی تخلیق کے لیے اجتماعی تعاون اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہماری بنیادی ضرورتوں کا دباؤ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے اس سے جس منظر نامے کی تشکیل ہوتی ہے اس کو ثقافت کا پہلا مرحلہ سمجھا جاتا ہے۔ آگے چل کر ضرورتیں اور تعاون کی صورتیں اس مرحلے کو وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جاتی ہیں۔

الکروبر (Al Karobar) اور مانو سکی کے مطابق ثانوی ماحول کی تخلیق، بنیادی ضرورتوں کے دباؤ اور معیار زندگی کے حصول کی بنا پر ہوتی ہے یہ عملی زندگی جو دو گروہوں کے ثقافتی رویے میں کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ثقافت ثانوی ماحول تو ہے لیکن یہ صرف بنیادی ضرورتوں کا شاخسانہ ہی نہیں اس میں بنیادی ضرورتوں کی تسکین سے بڑھ کر کچھ پسندیدہ اور تخلیقی عناصر بھی شامل ہوتے ہیں اور یہی صورتیں ایک ثقافت کو دوسری ثقافت سے ممتاز کرتی ہیں و گرنہ کھانا تو ہر معاشرے میں پکتا ہے لیکن کھانے کی اشیاء اور کھانا بنانے کے جو طریقے ہیں وہ ہر معاشرے کے الگ الگ ہوتے ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ثقافتی اقدار انسان کو ذاتی مفاد سے بلند تر کر دیتی ہیں، انسان کو جذباتی سطح پر ایک ارفع احساس کے ساتھ زندہ رہنے کا سلیقہ عطا کرتی ہیں تو دراصل ہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں تاج محل مقبرہ ہوتے ہوئے بھی صرف مقبرہ نہیں اور شاہ نامہ تاریخ ہوتے ہوئے بھی صرف تاریخی دستاویز نہیں۔

ثقافت کا ایک اور قابل غور پہلو جو مندرجہ بالا تعریفوں کی مدد سے سامنے آتا ہے وہ ایک مشترک رویہ ہے۔ یہ رویہ چوں کہ اجتماعی ہوتا ہے اور اس کا تعلق طرز عمل سے ہوتا ہے اس لیے اس کو ثقافتی وصف کا درجہ دیا جاتا ہے۔ مذہب، معیشت، عقائد و افکار معاشرے کے بنیادی اداروں کی حیثیت سے معیارات کی تشکیل کرتے ہیں اور یہی معیارات اس مشترک رویے اور طرز عمل کی اصل قوت ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً مغربی معاشرے میں عورت کو دیکھتے ہی ہیٹ کو سر سے اتار کر تعظیم دینا شروع کر دیتے ہیں البتہ اس

سلسلے میں اس بات کا خاص خیال رکھا جانا چاہیے کہ طرز عمل کا اجتماعی ہونا بہت ضروری ہے انفرادی اعمال واطوار ثقافتی وصف کا درجہ نہیں رکھتے۔ڈاکٹر جمیل جالبی طرز عمل پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> طرز عمل کو کلچر کے ذیل میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اظہار معاشرے کے مختلف گروہوں، طبقوں اور افراد میں بے ظابطگی کے ساتھ یکساں طور پر ہونا چاہیے۔ مثلاً جب میں گھر سے باہر جاتا ہوں تو دایاں پاؤں پہلے باہر رکھتا ہوں یہ میرا انفرادی معاملہ ہے لیکن اگر معاشرے کے افراد عام طور پر گھر سے باہر جاتے وقت نیک شگون کے طور پر دایاں پیر پہلے باہر رکھنے لگیں تو اس عمل سے افراد کے طرز عمل میں باضابطگی پیدا ہو جائے گی اور یہ کلچر کی ذیل میں شمار ہو گا۔[۷]

بالکل اسی طرح دادی اماں کا پوتی کو جوتا گھسیٹ کر چلنے سے منع کرنا، دوپٹا اوڑھنے کی تلقین کرتے رہنا دونوں وقت ملتے ہوں تب چھت پر کھڑے ہونے سے روکنا، غرض شادی بیاہ، نکاح، جنازہ، دفن کرنا وغیرہ سب ایک مخصوص معاشرے کے ثقافتی اوصاف کہلائیں گے۔ ثقافت کا یہ مخصوص پہلو تہذیبی و تربیتی پہلو کہلاتا ہے کیوں کہ ایک طرح سے یہ وہی راستہ ہے جس سے گزر کر انسان گروہی تجربات سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ معاشرے کا رنگ ڈھنگ اختیار کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو اسی میں معاشرے کی یک جہتی اور اس کے ساتھ ساتھ مزاحمتی قوت کا راز بھی پوشیدہ ہے۔

مختلف تعریفوں کے پس منظر میں ثقافت کے مفہوم کی مذکورہ بالا بحث کو سمجھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے اس خطہ زمین پر رہتے ہوئے جب سے شعور کی حدوں میں قدم رکھا اس کی سوچ کا محور یہ چیز ہی رہی ہے کہ عرصہ حیات کو کس طرح مسرت کی کیفیت اور امن کی حالت سے ہم کنار کیا جائے۔ مادی مظاہر اور انسانی تعامل کے درمیان سرحدی جدلیات کی حقیقی بنیاد یہی خواہش ہے۔ اسی سیاق و سباق میں لفظ کی تخلیق ہوئی، اوزار وآلات ایجاد ہوئے گھروں کی تعمیر کی گئی، شہر بسائے گئے۔ مجلسی و معاشرتی آداب وضع کیے گئے تاکہ انسان زیادہ سے زیادہ بامعنی اور باوقار طریقے سے زندگی گزار سکے۔ اجتماعی طرز عمل کے اس بھرپور مظاہرے کا نام ثقافت ہے جو چہرے کی طرح معاشرے کی پہچان ہوتی ہے۔

ثقافت کے بنیادی عوامل:

اجتماعی طرز عمل کے جس بھرپور مظاہرے کو ثقافت کا نام دیا گیا ہے اسکے بنیادی عوامل کیا ہیں یہ ایسا سوال ہے کہ جس کا جواب ثقافت کے تصور کی مزید وضاحت کے لیے ضروری ہے۔ البتہ ایک بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ بنیادی طور پر ثقافت ایک ناقابل تقسیم حقیقت کی طرح ہے اور اسے اسی سیاق و سباق میں ہی پرکھنا چاہیے۔ یہ

جن عوامل کا فطری نتیجہ ہے انہیں کسی شعوری سکیم کے تحت اکٹھا نہیں کیا جاتا۔ ٹی ایس ایلیٹ نے اسی بات کو اپنے طویل مضمون *Towards the definition of Culture Notes* میں بیان کرتے ہوئے ان لفظوں میں وضاحت کی ہے۔

ثقافت کی نشو نما کی یہ صورتیں بڑی فطری ہوتی ہیں ان کی کیمیائی اور ترکیبی ساخت بڑے فطری ماحول میں ہی سامنے آتی ہے۔ ہم ان عوامل کے راستے میں رکاوٹ بننے والے تعصبات اور غلط افکار کے خلاف بات تو کر سکتے ہیں اواسی طرح ثقافتی نشو نما میں معاون ہونے والے عوامل پر بھی بحث ممکن ہے لیکن اگر یہ سوچیں کہ بذات خود ان عوامل کو گھٹا بڑھا کر ایک ثقافت تخلیق کر لیں تو یہ ناممکن ہے۔۔۔[۸]

بہر کیف یہ اہم ترین عوامل تین ہیں اور ان کی فطری درجہ بندی کچھ اس طرح ہو گی۔

۱۔ اجتماعی (معاشرہ)

۲۔ افکار (DominantIdeas)

۳۔ مظاہر ثقافت

ثقافت کی وجود پذیری اپنی اولین سطح پر ایک اجتماعی شکل اور امداد باہمی کے ماحول کی متقاضی ہے اور یہ ماحول انسان کو اس کے عدنی السطح ہونے کی بنا پر فطری طور پر حاصل ہوتا ہے۔

اس حقیقت کو مرل (Merl) نے بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ "معاشرے کا حقیقی جواز دو یا دو سے زیادہ افراد کا با معنی تعامل ہے اور یہی معاشرے کی ابتداء ہے۔"[۹]

مزید براں ابن خلدون اجتماع کو ایک بنیادی عمل قرار دیتا ہے اور فرانسیسی ماہر بشریات ڈر کھیم تہذیبی اقدار کا منبع معاشرے کو گردانتا ہے معاشرے سے مراد یہاں ہر گز ایک جم غفیر نہیں بلکہ ایک بالکل نئی حقیقت مراد ہے۔ ایک صورت تو صرف اکٹھا رہنا ہے جیسے جانور اور انسان مل جل کر رہتے ہیں اور دوسری کسی قاعدہ اور قانون کے تحت زندگی بسر کرنا ہوتا ہے۔ یہ دوسری قسم کی زندگی معاشرتی زندگی ہے۔ ایسی زندگی کہ جس کا ہر عمل اور ہر حرکت قوانین اور معیارات کے مطابق ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ثقافت کے بنیادی عوامل معاشرتی اور اجتماعی حقیقت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے تمام افراد پر معاشری اکائی حصہ ہونے کی بنا پر لاگو ہوتے ہیں اور ایک طرز عمل کو جنم دیتے ہیں۔ مشہور ماہر بشریات ڈر کھیم کا کہنا ہے کہ جب انسان اکٹھے ہوتے ہیں تو ان کے اجتماع سے ایک نئی نفسیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔۔۔اس اجتماع سے جہاں رابطہ اور بحث سامنے آتی ہے وہیں سے تہذیب کی بڑی بڑی اقدار بھی جنم لیتی ہیں۔

معاشرتی ڈھانچے کو بنیاد فراہم کرانے والی یہ اقدار اور معیارات ول ڈیوارا (انسانی تہذیب کا ارتقاء) کے لفظوں میں افکار عظیمہ (Dominant Ideas) کہلاتے ہیں اور ان کا وجود معاشرے کے عمل اور رد عمل میں اس اشتراک کا موجب ہوتا ہے۔ جو ثقافت کے لیے نہایت اہم ہے۔ یہ سوال کہ انسان کی معاشرتی زندگی کے ڈھانچے کو اعتبار دینے والی ان اقدار و افکار کے حقیقی سرچشمے کون سے ہیں، اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ماہرین معاشیات نے اس تحقیق کے اعتراف کے باوجود کہ یہ تصورات اور اقدار دوسری قوموں کے اختلاف، تاریخی واقعات، گرد و پیش کے طبعی حالات اور آب و ہوا کی وجہ سے صورت پذیر ہوتے ہیں یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ ان کی جڑیں مذہب و عقائد کے حوالے سے انسانی روح کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی ہوتی ہیں اور یہی وہ واحد صورت ہے جس کی بنا پر یہ اقدار فرد سے ماورا ہو کر ڈرکھیم کے لفظوں میں معاشرے کو ایک بالاتر روحانی حقیقت کا درجہ دیتی ہیں۔ یہ درجہ ثقافت کے لیے کتنا ضروری ہے اس کی تفصیل میں جاتے ہوئے یہ فرانسیسی ماہر بشریات لکھتا ہے اب اگر اخلاق کا ماخذ معلوم کرنا ہو تو وہ فرد نہیں ہو سکتا کیوں کہ کبھی کسی ایسے فعل کو جس کی منشا فرد کی ذاتی نمو یا ہو اخلاقی نہیں کہا جا سکتا۔ ہر اخلاقی فعل میں بے غرضی اور ایثار ہونا ضروری ہے۔ یہ لوازمات تب تک نصیب نہیں ہو سکتے جب تک ہم اپنے آپ کو کسی صاحب ارادہ ہستی کے تابع نہیں بنا لیتے۔ ایسی ہستی یا تو خدا ہو سکتی ہے یا پھر معاشرہ کروبر (Krober) نے اپنے طویل مضمون مشمولہ انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنز میں کہا ہے کہ کسی بھی ثقافت کے مظاہر خود کوئی اہمیت اور قوت نہیں رکھتے ان کا گہرا رابطہ ہوتا ہے۔ فکری اخلاقی اور دینی سرچشموں سے اور ثقافت انہی سے بنتی ہیں۔ [۱۰]

اس سلسلے میں مسلمان مفکر غزالی کا خیال بھی قابل توجہ ہے: معاشی ضرورتوں سے جو تعاون پیدا ہوتا ہے اس میں صفت اعتدل حسن، خیر اور سعادت پیدا کرنے کے لیے روحانی محرک لازمی ہے ورنہ یہی معاشی تقاضے اختال تمدن کا باعث بن جاتے ہیں۔ [۱۱]

حضرت شاہ ولی اللہ بھی فرد کی ثقافتی ذمہ داریوں کے ضمن میں بیداری اساس کے لیے داخلی طور سے خدا اور رسول پر ایمان، حسن اور نیکیوں پر اعتماد ضروری سمجھتے تھے۔ [۱۲]

دور حاضر کے ثقافتی نقاد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ کوئی ثقافت مذہب سے رشتہ استوار کیے بغیر ترقی نہیں کر سکتی جب کہ ڈاکٹر ایس ایم یوسف کہتے ہیں کہ: ثقافت ایک ذہنی وصف ہے تو ان کا اشارہ بھی (Dominant Ideas) کی طرف ہی ہے وہ اپنے ایک طویل مضمون میں اسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

ثقافت حقیقی معنوں میں۔۔۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں انسانی رویوں کی کہانی ہے اور یہ

رویے چند بنیادی اقدار کے احساس سے تشکیل پاتے ہیں۔[۱۳]

آگے چل کر اپنے اسی مضمون میں ڈاکٹر ایس ایم یوسف نے ایک بڑی اہم بات کہی ہے: جیسے ہی یہ احساس ہر قسم کی تکنیک سے پاک ہو جاتا ہے اور یقین کے ایسے درجے پر فائز ہوتا ہے جہاں کسی مخالف قوت کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو پھر اسے ایمان اور اعتقاد کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ مذہب، اخلاق اور عقائد (افکار عظیمہ) کا ثقافت کے ساتھ ایک گہرا رشتہ اور تعلق موجود ہے، یہ بات توجہ طلب رہ جاتی ہے کہ یہ تعلق کس نوعیت کا ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے اس تعلق کو بڑے سرسری انداز میں قائم کیا ہے اس نے تو ثقافت کو مذہب سے زیادہ جامع چیز گردانا ہے اور اس کے نزدیک مذہب زیادہ سے زیادہ یہی عمل کرتا ہے کہ کچھ اخلاقی اوصاف اور جذباتی رنگ مہیا کر دیتا ہے اگر ایک خاص رخ سے دیکھا جائے تو طرز عمل میں اشتراک کا جواز بھی یہیں سے بنتا ہے اور یہ بات تو اظہر بن الشمس ہے کہ ثقافت اسی مجموعی طرز عمل سے ہی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ بلاشبہ ہم ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ دیکھ سکتے ہیں اور مذہبی حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب ثقافت کا حصہ ہے۔[۱۴]

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا موقف بھی اس سلسلے میں نہایت صائب ہے۔

> اس تمام بحث میں دینی عقائد کو بھی علیحدہ نہیں کر سکتے۔ مختلف تہذیبوں کی پیداوار میں مختلف عناصر اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ ان کو الگ کرنا دشوار ہے۔[۱۵]

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ بعض اوقات دونوں کے درمیان ایک دوئی کا احساس ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب انسان کبھی کبھار اپنے معاشرتی رویوں اور مذہبی عقائد کے درمیان ایک خلیج حائل دیکھتا ہے لیکن اس کے باوجود گہری نظر سے دیکھیں تو اس کی نوعیت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ مذہب معاشرے کے افراد کے مکمل طرز حیات کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ایسا طرز حیات جو لحد سے لے کر محد تک اور دن سے رات تک کے کام کاج یہاں تک کہ سونے سے لے کر جاگنے تک چھایا ہوا نظر آتا ہے۔

یہی طرز حیات ہی تو ثقافت ہے۔ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ہم اعمال انسانیہ اور رسوم کی ایک فہرست تیار کریں تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ زندہ مذہب ثقافت کا حصہ نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ کلچر میں انسانی سرگرمیوں کے سارے ادارے مذہب، سیاست، معیشت، فنون، سائنس، تعلیم اور زبان وغیرہ شامل ہیں۔۔۔ تو یہ بھی نمایاں ہوتا جاتا ہے کہ وہ مذہب کو بھی ثقافت کا ایک ادارہ (بنیادی ہی سہی) سمجھتے ہوئے ان دونوں میں جزو اور کل کا رشتہ قائم کر رہے ہیں۔ حالاں کہ یہ رشتہ جزو اور کل کا تو یہ ہے ہی نہیں۔ اس کی تو نوعیت ہی دوسری ہے۔ مذہب ثقافت کے لیے داخلی روح کا درجہ رکھتا ہے۔

سید زبیر نیازی علامہ اقبال کے پہلے خطبے کا ترجمہ کرتے ہوئے تشریح کے ضمن میں لکھتے ہیں:

تمدن عبادت ہے اس شعوری اور ارادی جد وجہد سے جو انسان زندگی کے گوناگوں تقاضوں کے پیش نظر کرتا ہے کہ اپنی امتیازات عزائم اور مقاصد کی تکمیل کرے۔ مذہب انسان اس کے برعکس وہ نقطہ نظر، وہ اصول، وہ منہاج اور وہ دستور العمل ہے جس سے اس جد وجہد کو مستقل اور محکم اساس مل جاتی ہے۔ بغیر اس کے ناممکن ہے کہ ہم ایسی مساعی تمدن میں خیر اور سعادت اور کامرانی کا منہ دیکھ سکیں۔[۱۶]

ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے بھی جزو اور کُل کے تعلق کی بجائے اسی نوعیت کو ایک مثال سے واضح کیا ہے جس طرح سردی گرمی، مرطوب آب و ہوا اور طبعی حالات ثقافت کو ایک رنگ و روپ دیتے ہیں۔ ہمارے رہن سہن، لباس اور تعلقات کو ایک شکل عطا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود سردی گرمی ثقافت کا جزو یا حصہ نہیں بلکہ اس طرح مذہب کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ثقافت کا جزو یا حصہ نہیں بلکہ اس کے قلب میں اصول عمل کا درجہ رکھتا ہے۔ بلاشبہ مذہب اور ثقافت کے رشتے کی یہ مخصوص نوعیت ایسی نہیں کہ جسے آسانی سے بغیر رد و قبول کے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ خاص طور پر آج کے جدید فکری رویے، مذہب اور ثقافت کی تعدیل (Equation) کو یوں بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ان کا کلامی موقف اپنے نتائج کو حسی ادراک اور محسوسائی تصورات کے حوالے سے ترتیب دیتا ہے۔ ظاہر ہے ان حالات میں مذہب کا مابعد الطبعیاتی حصہ اور اس کی الحاقی فکر پر زور دینا یا اس کی اہمیت پر اسرار انسانیت کی ابتدا، زندگی اور اس کی نوعیت کا فیصلہ کرتا ہے۔ یوں خدائی ذات کو بے دخل کر کے صرف سماجی اور نظام اخلاق پر ہی ثقافتی اکائی پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں اور سماجی اور ثقافتی ترمیم و تقدیس کی بنیاد اور قوت کا سرچشمہ حقیقت مطلقہ کے ماورائی تصور کی بجائے انسانی نقش اور داخلی تجربے کو قرار دے دیا جاتا ہے۔[۱۷]

اس مؤقف کی خامیوں نے پوری شدت سے اس بات پر زور دیا ہے کہ اقدار کی برتری کی بنیاد تصدیق بلحواس اور اجتماعی سعادت سے وابستگی کی وہ زبردست جبلت ہے جو ایک دوسرے سے تعاون کے لیے آمادہ کرتی ہے۔

اخلاقی عینیت پرستوں انسیت (Humanism) کے حامیوں کے تناظر کو توضیح کرتے ہوئے ایڈون اے برٹنے اپنی کتاب فلسفہ مذہب میں لکھا ہے۔[۱۸]

جہاں پہلے ہمیں اس مقصد سے سکون میسر آتا ہے کہ اس دنیا کی تشکیل میں ذات خداوندی موجود ہے جو ہماری حفاظت کی ذمہ داری ہے۔ وہاں اب انسانوں کے باہمی تعاون اور دوستانہ شرکت کا احساس زندگی کی تاریکیوں میں مشعل راہ بنتا ہے۔ تمام جذباتی امیدیں اور خواہشاتی فکر قابل ترک ہے ان کی جگہ معاشرتی نظام اور تعلیم کی مدد سے معقول مقاصد کے حصول کی تمنا پیدا کرنی چاہیے۔ اب مسئلے کی حقیقی صورت کچھ اس طرح بن جاتی ہے کہ ایک جانب

وہ لوگ ہیں جو مابعدالطبیعات کے حوالے سے عقیدہ کو سماجی یا ثقافتی نصب العین کے حصول کے لیے ضروری نہیں سمجھتے۔ ان کی نظر میں یہ منزل صرف سماجی اخلاقیات اور بہبود کے کسی اعلیٰ تر بروپر وگرام سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے اور دوسری طرف وہ منکرین ہیں جن کے نقطہ نظر کے مطابق مذہب میں الہامی فکر کو مرکزی اہمیت حاصل ہے اور اس پر ایمان اور اعتقاد کی غیر موجودگی میں اخلاقی اقدار کی قوت مقتدہ مفلوج ہو سکتی ہے۔ کسی بھی جماعت کے لیے وحدت کا حصول ناممکن ہو سکتا ہے۔ ثقافت کے عوامل میں تیسرا درجہ فطرت کے سیاق و سباق میں اعمال انسانیہ کے ذریعے تبدیلیوں کا ہے۔ انسان کی یہ اولین خواہش رہی ہے کہ وہ اپنے عرصہ حیات کو زیادہ سے زیادہ سکون امن اور شائستگی کے ساتھ گزارنے اور خواہشوں کے حصول کی خاطر ایسا نظام وضع کرے، جو ایک اعلیٰ تر سطح پر زندگی گزارنے کا جواز بن سکے۔ دیکھا جائے تو اسی ضرورت کے پیش نظر ہی اس نے اپنی تخلیقی توانائیوں کو بروئے کار لا کر اپنی سہولت کی چیزیں ایجاد کیں۔ آفت سماوی سے بچنے کے لیے گھر تعمیر کیے۔ دشمن کی کارگزاریوں سے بچنے کے لیے قلعے تعمیر کیے۔ ضروریات زندگی کے دباؤ کے لیے منڈیوں کا نظام بنایا اور آداب معاشرت مجلسی اخلاقیات اور رسوم ورواج کو جنم دیا۔ یہ سب مظاہر ثقافت ہیں نسل انسانی کی ان کوششوں کا ثمر جو وہ مل جل کر رہنے کے لیے کرتا ہے۔ یہ ثقافت کی وہ مشہور سطح ہے جو کسی بھی معاشرے کا تشخص ہوتی ہے۔

ثقافت کو مظاہر کے حوالے سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے بلکہ عام طور پر ان دو حصوں میں کئی عوامل کو تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ثقافتی عناصر کا تعلق چوں کہ انسان کی طبعی ضرورتوں سے ہوتا ہے یا پھر اس کی نفسی اور روحانی تسکین سے ہوتا ہے اور یہی دونوں باتیں مظاہر فطرت کے پھیلاؤ کا جواز بنتی ہیں مثلاً طبعی ضرورتوں سے متعلق خواہشات صنعتی تجارتی و زرعی توسیع کی طرف لے جاتی ہیں۔ یوں مادی مظاہر ثقافت کے فروغ کا جواز مہیا کرتی ہیں دوسری طرف نفسی یا روحانی تسکین کی خواہش غیر مادی یعنی فکری و جمالیاتی مظاہر کا سبب بنتی ہے۔ دونوں قسم کے ثقافتی مظاہر کے بارے میں ایک بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ انسان کی طبعی و نفسی تگ وتاز کے شواہد ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غیر مادی مظاہر کو بعض اوقات انسانی ترقی کا اس طرح سے ثبوت نہیں سمجھا جاتا جس طرح کسی مادی مظہر کو سمجھا جاتا ہے۔

برصغیر پاک وہند میں صدیوں سے ایک رنگین و مخلوط ثقافت چلتی آ رہی ہے۔ رنگ رنگ کے لوگ اس دیس میں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس معاملے میں ایک بڑا عمل دخل بیرونی حملہ آوروں کا بھی رہا، تقسیم کے بعد پاکستان کے سامنے کلچر و ثقافت کا ایک اہم مسئلہ کھڑا ہو گیا جس پر بہت سارے دانش وروں نے لکھنا بھی شروع کیا۔ ایک خاص زمانے میں یہ تمام بحث پوری آب و تاب کے ساتھ کی جاتی رہی ہیں۔ بار صغیر کی ایک طویل ثقافتی

تحریک ہے جو کہ مختلف مذاہب کے ساتھ جڑتی چلی جاتی ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم قیام پاکستان کے بعد کی صورت حال کا مختصر اجائزہ لیں گے لیکن اس سے پہلے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنی ضروری ہے جن کو اسلامی ثقافت کے نمائندہ پہلو کیا جاتا ہے ڈاکٹر شعیب رضوی اسلامی ثقافت پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ان کو نکات کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔[۹۱]

۱۔ اسلام کا تصور قومیت اپنی ثقافت پر عمل کرنے والوں کو جوڑے رکھتا ہے کیوں کہ رنگ وروپ کی بنیاد پر کسی کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔

۲۔ اسلامی ثقافت عقیدہ توحید کی اساس پر قائم ہے۔

۳۔ اسلامی ثقافت کے مطابق حیات وکائنات کے سارے مظاہر ایک اصل کے تابع ہیں۔

۴۔ ختم نبوت کا تصور اسلامی ثقافت کا پکا عنصر ہے کہ آنخضرت کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔

۵۔ ایک اور اہم تصور جس سے اسلامی ثقافت کا مزاج متعین ہوتا ہے حیات بعد الموت کا عقیدہ ہے یعنی کہ زندگی صرف دنیاوی زندگی نہیں ہے بلکہ موت کے بعد ایک دائمی زندگی آخری زندگی ہے۔

۶۔ کسی بھی ثقافت کے اسلامی وغیر اسلامی ہونے کا فیصلہ اس کے تصور حقیقت سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا ثقافت اور کلچر کو ایک ہی معنوں میں لیتے ہیں یہ ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے کلچر کے موضوع پر زوردار بحثیں کی۔ قومی تشخص اور ثقافت کی وضاحت کرتے ہیں: پاکستان کے بننے سے پہلے مسلمان قوم برصغیر میں وجود میں آچکی تھی۔ اس کی قومیت کا آغاز دو طریقوں سے ہوتا ہے ایک محمد بن قاسم کی سندھ آمد اور دوسرا مسلمان صوفیاء کی برصغیر میں آمد مگر یہ ۱۹ویں صدی کے ربع آخر میں ابھری جب سر سیّد احمد خان، حالی، شبلی، اکبر الہ آبادی اور دوسرے اکابرین نے تصویر دکھائی اور مستقبل کا خواب عطا کیا۔ یوں مسلم قومیت میں اسلامی تہذیب کا پھیلاؤ بھی شامل ہو گیا اس کے بعد جب ۱۹۴۱ء میں مسلمان قوم ارض پاکستان کے حصول میں کام یاب ہوئی تو مسلم قومیت میں حب الوطنی کے عنصر کا اضافہ ہو گیا۔ جس جگہ پاکستان بنا وہاں کا اپنا ایک ماضی تھا اپنی ایک Vertical Depth تھی جو ہزار ہا برس پر پھیلی ہوئی تھی اور جو زبان لباس رسم ورواج اور پھر زندگی کے لاتعداد مظاہر میں جلوہ گر ہو رہی تھی۔ اس لیے پاکستان کو جہاں اسلامی تہذیب ورثے میں ملی وہاں ارض پاکستان کا ماضی بھی اس نے ورثے ہی میں حاصل کیا۔ آگے چل کر انھی دونوں زاویوں سے پاکستانی ثقافت کے نقوش واضح ہونا شروع ہو گئے۔ کسی بھی ثقافت کے بارے میں جاننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے عمودی پہلو کے ساتھ ساتھ اس کے افقی پہلو کا بھی جائزہ لیا جائے۔ اگر ہم پاکستانی ثقافت کے افقی پہلو کو دیکھیں تو وہ جگہ جہاں پاکستان بنا وہاں پہلے سے ذیلی ثقافتیں موجود تھیں

جو پاکستان بننے کے بعد قومی ثقافت کا خون گرم کرنے لگیں۔ پاکستانی ثقافت اب تک تخلیق کاری کے عمل سے گزر رہی ہے مختلف ذیلی ثقافتوں کے ہونے کی وجہ سے اس کی شکل روز بروز واضح ہوتی جا رہی ہے اور اس میں نکھار آتا جا رہا ہے۔ تہذیب اور ثقافت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں ثقافت فنون لطیفہ اور سائنس کی دریافتوں کے علاوہ زندگی میں تنوع اور روحانی بازیافت کی صورت میں اپنی جھلک دکھاتی ہے مگر تہذیب مزاجار جحان نقل کے تابع ہے۔[۲۰]

پاکستان کا قیام تہذیبی عوامل کی ایک واضح شناخت کی بنیاد پر ہوا تھا لیکن لگاتار جمہوری تجربوں کی ناکامی اور ایک طویل آئینی خلاء نے وہ صورت حال پیدا کر دی کہ جس نے آخر کار قومی تشخص کے تصورات کو بھی نگلنا شروع کر دیا۔اس کا پہلا عملی مظاہرہ تو اس وقت ہمارے سامنے آیا جب پہلی بار مشرقی پاکستان کے صوبے میں مسلم لیگ کو انتخابات میں شکست ہوئی اور متعدد سیاسی رہنماؤں نے دانستہ یا نادانستہ وحدت بنانے والے عناصر کی بجائے وحدت توڑنے والے عناصر پر امتیاز ور دینا شروع کر دیا کہ یوں محسوس ہونے لگا پاکستان ایک مکمل ملک نہیں بلکہ کئی متصادم ثقافتی علاقوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ پاکستان علاقائی سطح پر متنوع، نسلی و لسانی وحدتوں کا مرقع ہے لیکن مذہب و مشترکہ تاریخ کا حوالہ بھی قومی یک جہتی کے حصول کے لیے کوئی کمزور حوالہ نہیں تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں مختلف رنگ ہونے کے باوجود بھی امریکہ ایک قوم کا نام ہے۔ لیکن پاکستان میں آئین کے تدوین میں مسلسل ناکامیوں، مارشل لاء کے نفاذ اور سیاسی حماقتوں نے مختلف حصوں میں احساس محرومی کو کچھ اس طرح سے فروغ دیا کہ علاقائی، ثقافتی اور لسانی اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ مشترکہ ثقافتی تشخص جو ایک سال تک اپنے ہونے کا بار بار احساس دلاتا رہا، بعض طالع آزما جرنیلوں اور سیاست دانوں کا پیدا کردہ ہے۔ بے یقینی اور عدم تحفظ کی فضاء تشکیک کے دبیز پردوں میں چھپنے لگی۔

ہماری اجتماعی جدوجہد اور تاریخی عمل نے مل جل کر جن جغرافیائی حدود کو ایک نئی مملکت کی صورت بخشی تھی ہم نے ان کے اندر رہتے ہوئے مسلم قومیت کے مشترکہ اور وسیع تر نظریے کی ڈوری میں علاقائی تقاضوں اور تہذیبی اکائیوں کو پرو کر ایک پاکستانی قوم اور ثقافت کو تخلیق کرنا تھا لیکن ایسا نہ ہو پایا اور ہمارا ادبی و فکری وجود ان سوالات کی پکڑ چلتا چلا گیا کہ دوسروں سے ہمارے ثقافتی و تاریخی رشتوں کی معنویت کیا ہے؟ اور ہمارا قومی شخص کن عوامل کی تالیف ہے؟

اس صورت حال میں ناول کا حوالہ معاشرے کی سیاسی و سماجی سوچ کی عکاسی کے ضمن میں ایک معتبر حوالہ بنتا ہے۔ ناول کے آغاز سے لے کر آج تک جتنے ناول لکھے گئے کہیں نہ کہیں سماجی اور سیاسی سوچ کے ساتھ ساتھ ہمارے ثقافتی مظاہر کا بیان بھی ملتا ہے چاہے وہ سرشار ہوں یا نذیر احمد، شرر ہوں یا کوئی حقیقی ناول نگار۔ ۱۹ویں صدی

میں آکر تو یہ صورت حال مزید واضح ہونے لگتی ہے میرے بھی صنم خانہ، اداس نسلیں، نادار لوگ، غلام باغ یا اس سے پہلے کوئی بھی پرانا ناول اٹھا کر دیکھ لیا جائے سب ایسے ہی ان ثقافتی سوالوں کی دلدل کے گرد چکر لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد روز بروز بڑھتی ہوئی دوری کی المناکی، ملال آزردگی نے سب سے پہلے اس تصور کو ہی نشانہ بنایا جو تحریک پاکستان کی اساس تھا یوں ناول میں اپنی جڑوں کی تلاش کے ایک نئے سفر کا آغاز ہوا۔ پھر سقوط مشرقی پاکستان، بلوچستان کا تصادم، سندھ کے فسادات اور صوبوں کے درمیان بڑھتی ہوئی تناؤ کی فضا اور اب مسلمانوں پر دہشت گرد ہونے کا سنگین الزام، ہمارا عالمی استحصال، ۹/۱۱ کے بعد خوف کی صورت حال، نیا عالمی نظام، سپر پاوروں کا ہدف اور یہ بڑھتا ہوا شور اس تمام صورت حال نے ان سوالات کو اور زیادہ گھمبیر، پیچیدہ اور تہہ دار بنا دیا ہے۔ اس طرح تہذیبی و ثقافتی تشخص کی بنیادی صداقت سے محرومی قیام پاکستان کے بعد اردو ناول کا اہم ترین مسئلہ بن گئی۔

سرسری طور پر نگاہ دوڑائی جائے تو پاکستان کی ثقافت چند بڑے حصوں میں تقسیم ہے جن میں ۴۷ کی تقسیم، سقوط ڈھاکہ اور دوسرے صوبوں کی آپس میں چپقلش اس لیے یہ باتیں اور حالات ہماری ثقافت کا حصہ بنتے چلے گئے۔ ناول ساسا کا، میرے نزدیک سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ ناول نگار نے بہت خوب صورتی کے ساتھ ثقافت میں آنے والی تبدیلی سے پہلے کے حالات کا مطالعہ کر کے ثقافت میں تبدیلی کے آنے کے بعد کی صورت حال کو بیان کیا ہے کیوں کہ یہ وہی بڑی ثقافتی تبدیلی ہے جس کے اثرات آج تک ہم پر پڑ رہے ہیں اور ہم قیمتی جانوں کے ذریعے اس کا قرض ادا کر رہے ہیں۔ خدا جانے کب تک ہم اپنے لوگوں کی جانیں اس بھٹی میں جھونکتے رہیں گے۔ ناول میں جو ثقافتی دنیا ہے تو اس کا سب سے اہم نقطہ ۹/۱۱ کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال ہے۔

پاکستان اتنی آسانی سے نہیں بنا اس بات سے کوئی بھی انکاری نہیں ہے۔ لوگوں نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا ، اپنا اسباب لٹایا اور پھر پاکستان میں قدم رکھ سکے۔ یوں ایک ثقافتی ورثہ خود بخود تشکیل پانے لگا آج بھی کچھ بزرگ مل جاتے ہیں جو اپنی بے نور آنکھیں لیے بیتے زمانے کی روداد سنا رہے ہوتے ہیں یوں ہمارے ہاں بزرگی ایک ثقافتی پہچان بھی ہے۔ اب یہ لوگ گردش زمانہ کی نذر ہوتے چلے جا رہے ہیں کیوں کہ موت تو کسی کو موقع اور مہلت نہیں دیتی کہ چلو آج تم اپنے کام نمٹا لو میں کل تمھاری روح قبض کر لوں گی۔ اور موت بھی حرکت کی ایک شکل ہے۔

ہمارے تعلیمی نظام اور امریکہ کے تعلیمی نظام میں بہت فرق ہے۔ نا صرف وسائل کی وجہ سے بلکہ ثقافتی حوالوں سے بھی ہمارے تعلیمی نظام کی اساس مذہبی نوعیت کے مدرسوں پر تعمیر کی گئی ہے اور بدقسمتی سے آج بھی ایسی

ہی صورت حال ہے جب کہ امریکہ میں تبدیلی و ترامیم سے کام کرتے ہوئے ایک اعلیٰ تعلیمی نظام قائم کیا گیا ہے اور آئے دن اسے بہتر بنانے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ یہی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امریکہ کا طالب علم تعطیلات میں بائیکنگ، ملاقات، دوسرے ملک کی سیر کے منصوبے بنا رہا ہوتا ہے اور ہمارا طالب علم دیہاڑی اور پیسے کمانے کے بارے میں پریشان رہتا ہے۔ یہ ثقافتی اقدار کی انتہائی ذیلی سطح ہے۔ ثقافت کی تشکیل ایک خود کار د عمل ہے یہ حالات کے مطابق شکل تبدیل کرتی رہتی ہے ہم صرف اس کی بہتری کے لیے کوشش کر سکتے ہیں جو ہم بالکل بھی نہیں کرتے ہیں۔

ہم نے پہلے ذکر کیا کہ ثقافت دونوں مظاہر پر مشتمل ہوتی ہے مادی و غیر مادی۔ اس طرح یاد اور خاص طور پر اپنی مٹی کی یاد لوگوں کی یاد پردیس میں رہنے والے کے دل کو اکساتی رہتی ہے جہاں ایک طرف پردیس کی فضا تبدیلی پیدا کرتی ہے، وہیں وہ شخص کسی نہ کسی صورت میں اپنی ثقافت کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔ چاہے وہ زبان ہو، لباس ہو، خیال ہو یا یاد ہو اس طرح کا ایک اشارہ سلیم کے ہاں بھی موجود ہے:

> مجھے امریکہ آئے قریباً دس ماہ گزر چکے تھے اور میری طبیعت میں کچھ ٹھہراؤ بھی آ رہا تھا۔ ایم۔اے انگریزی کے دو سمسٹر ہو گئے تھے۔ اینا مل چکی تھی، میرے مضامین پاکستان میں انگریزی اخبار اور جرائد میں چھپنے لگے تھے اور گاڑی تو یہاں پہنچتے ساتھ ہی میں نے لے لی تھی۔ تاہم اگراب بھی جس کو جی بھر جانا بولتے ہیں ناوہ رہ جاہوا احساس نہیں آیا تھا سوا بھی تو یہ نہیں کی تھی۔ مجھے وطن کی یاد آتی تو تھی مگر ستاتی نہیں تھی میرا واپس جانے کو من نہیں تھا۔۔۔۔۔[۲۱]

پاکستان اور امریکہ سے مراد بنیادی طور پر ایک سپر پاور اور دوسرا تھرڈ ورلڈ کنٹری، دونوں کی تہذیبیں الگ الگ دونوں کے ثقافتی رشتے الگ سوان میں مساوات کسی صورت نہیں ہو سکتی ہے البتہ کچھ باتیں ملتی جلتی ضرور ہو جاتی ہیں۔ امریکہ میں ہاسٹل میں اسنوکر کھیلنے کی سہولت موجود ہے آپ اپنی پسند کو اسنوکر کے اصول سمجھا سکتے ہیں بلا روک ٹوک بات چیت کی جا سکتی ہے لیکن یہاں بھی ایک پابندی ہے کہ کوئی لڑکی کسی لڑکے کے کمرے میں نہیں جا سکتی۔ اس امر کی ممانعت ہے لیکن پھر بھی اس پابندی کی پاسداری کم کم کی جاتی ہے اور پاکستان کے ورثے کی جو ثقافتی صورت ہے وہاں تو پانی بھی موجود نہیں ہوتا اسنوکر ٹیبل تو دور کی بات ہے۔

فلم بینی باقاعدہ ایک مشغلہ ہے برصغیر و پاکستان میں فلم بینی کی روایت موجود ہے اور یہ ہماری ثقافتی خوبی شمار کی جاتی ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ خوبی شمار کی جاتی ہے۔ اب تو فلموں کو بین کرنا سینما گھروں پر تالے لگانا ہماری ثقافت ہے اور یہ کام مذہب کی بنیاد پر لوگوں کو مشتعل کر کے کیے جاتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے اس اعلیٰ معیار کی فلمیں

نہیں بن رہیں جو آدمی میں تبدیلی اور ذمہ داری کا شعور پیدا کر سکیں یا ایک آدمی خاندان کے ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھ سکے۔ اس بات کا تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ آج کے دور میں ہر کسی کی جیب میں ایک سینماگھر موجود ہے۔

جوانی کا کوئی موسم نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ تو تمام موسموں پر حاوی ہوتی ہے۔اسے فرق نہیں پڑتا خزاں ہو یا بہار، یہ رنگ بکھیرتی رہتی ہے۔گاؤں پاکستان کی ثقافتی شان سمجھے جاتے ہیں ناول نگار نے شان دار پیرائے میں بیان کیا ہے:

> میرے گاؤں میں جوانی عموماً ایسے موسم میں آتی ہے جب میمنوں سے لے کر گلہریوں تک اور تیتروں سے لے کر تیلیروں تک سب اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکل آتے ہیں اور کھلے میدانوں میں اچھل کود کر کے جوانوں کا شوق شکار کو شہ دیتے ہیں۔درخت سر جھکا کر اپنی ہر انسالی کا خراج میٹھے میٹھے جملوں کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔یہ موسم اس قدر رنگین ہوتا ہے کہ پھولوں کی خوش رنگی دوبالا ہو جاتی ہے۔بادلوں کی گھن گھرج تو بہت ہو کر رہ جاتی ہے مگر برکھا کی مستی گلی گلی محل محل جاتی ہے۔یہ موسم خوشبوئیں لگانے، گپیں ہانکنے اور آئینے کے سامنے بال سنوارنے کے فوراً بعد آتا ہے۔۔۔۔یکایک سینے میں ایک دل آگ آتا ہے اور کسی لاڈلے کی طرح شور مچانا شروع کر دیتا ہے۔ [۲۲]

بانسری دیہی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے۔ویرانوں میں گرم دوپہروں میں کہیں قریب یا دور سے بانسری کی آواز آتی جاتی ہے اور بانسری فن کار کا ایک بھرپور استعارہ ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ: روم جل رہا تھا اور ہنرو بانسری بجا رہا تھا۔

تہذیب میں ثقافت کا سفر ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے لیکن عجیب حیران کن بات یہ ہے کہ ایک ثقافت کے اندر دوسری ذیلی ثقافتیں موجود ہوتی ہیں جو دائرہ در دائرہ کی شکل میں موجود ہوتی ہیں۔جیسے کہ برصغیر کی ثقافت،اس کے اندر پاکستان کی ثقافت،اس میں سندھ اور پنجاب کی ثقافت،اس میں شہر و دیہات کی ثقافت،اس میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی ثقافت،اس طرح ثقافت اپنا عمل جاری رکھتی ہے۔

ثقافت اپنا مخصوص فن تعمیر بھی رکھتی ہے۔یہ کوئی پابندی والا معاملہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک رجحان ہوتا ہے جو پسند ناپسند،ماحولیاتی حالات کو مد نظر رکھتا ہے اور ترتیب پایا جاتا ہے جیسے کہ نتھیا گلی میں بنا ہوا مکان اور تونسہ شریف میں بنے مکان میں واضح فرق دیکھا جاسکتا ہے۔بلکہ اس طرح بڑے شہروں میں بڑھتی آبادی کی وجہ سے دو دو مرلے کے گھر ہوتے ہیں اور دیہاتوں میں مناسب آبادی ہونے کی وجہ سے ایک ایک کنال کے گھر پائے جاتے ہیں۔

> ہمارے گھر کا بڑا دروازہ شمال کی طرف کھلتا تھا۔اس کے ساتھ ہی مغرب میں ایک قطار میں چار کمرے تھے جن کا رخ جنوب کو تھا۔اس قطار کے چوتھے کمرے سے ملحق چار کمروں کی ایک اور قطار تھی جن کا

رخ مشرق کی جانب تھا۔ کمروں کے اس 'L' نما کے سامنے ایک وسیع صحن تھا جس کے بیچ میں ایک باغیچہ تھا جہاں امی جی نے گلاب سے لے کر گوبھی تک سب الابلا اگایا ہوا تھا۔۔۔ [۲۳]

گاؤں اور شہر میں فن تعمیر کے فرق کے ساتھ ساتھ لوگوں کی عادت و اطوار بھی الگ ہوتی ہیں۔ یہی بات ہے جب سلیم اسلام آباد میں ایک نجی یونیورسٹی جاتا ہے تو وہاں کا منظر نامہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کیوں کہ سلیم کا پس منظر الگ نوعیت پر مبنی تھا:

> مگر یہاں کے طلبہ یونیورسٹی کی آؤ بھگت کے برعکس تھے بلکہ (بلکہ) ان کے عجیب ہی نظارے تھے۔ لڑکوں کے دل تو کیا، مونچھیں بھی نہیں اگی تھیں اور لڑکیوں کے نقاب تو کیا دوپٹے بھی نہ تھے۔ سب بولتے ایسے چترچتر تھے جیسے محبت سمیت سبھی سوالوں کے جواب آتے ہوں۔۔۔ [۲۴]

'نائی' کو دنیا میں ایک پیشے کے نام سے جانا جاتا تھا لیکن نائی ہمارے ہاں صرف ایک فن یا پیشہ نہیں ہے بلکہ اس کی ایک بھرپور سماجی و ثقافتی حیثیت ہے۔ پاکستانی ثقافت خصوصاً دیہی ثقافت میں یہ شعبہ مستحکم صورت میں اب بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے فرق صرف اتنا ہوا کہ کچھ نائیوں نے اپنی اولاد کو پڑھائی کی طرف راغب کیا اور وہ معاشی طور پر مستحکم ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ کوئی بھی اطلاع پہنچانی ہو شادی کی یا فوتگی کی تو نائی کو یہ کام سونپا جاتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد مسلمانی کے لیے بھی نائی کو بلایا جاتا ہے۔ تقریبات کے موقعوں پر نائی باورچی کی خدمات بھی سرانجام دیتا ہے۔ نائی کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی بھی سماجی طور پر فعال ہوتی ہے۔ ملکانیوں کی خدمت کرتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ نائی کے پاس پورے گاؤں کی خبریں ہوتی ہیں۔ اب اس شعبے میں بھی ترقی ہو گئی ہے۔ مختلف سیلون بنا لیے گئے ہیں۔ ایجادات اور ہر طرح کی ترقی مختلف صورتوں میں پورے معاشرے پر اثرانداز ہوتی ہے۔

ہماری ثقافت میں رومال اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے دو بڑے مشہور تناظرات ہیں ایک تو ریشمی رومال کی تحریک ہے جب کہ دوسری وہ تحریک ہے جو ہر نوجوان اپنے رومال سے شروع کرتا ہے کسی مٹیار کو پٹانے کے لیے، شرمانے کے لیے اور للچانے کے لیے اس رومال کا سہارا لیا جاتا تھا لیکن اب تو یہ روایت بھی مقصود ہو کر رہ گئی ہے:

> میں نے منہ سے ہٹا کر ہاتھ جیب میں ڈالا اور اپنا خوب صورت رومال نکال کر منزہ کو دیا۔ وہ شرمائی اور اپنے ہاتھ کے اشارے سے میرے رومال کو واپس لوٹا دیا۔ اب میں اتنا بھی بچہ نہیں تھا کہ سمجھ نہ پاتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ ظاہر ہے رومال کو اپنے چہرے سے مسل کر کے واپس مجھے دینا ایسے تھا جیسے وہ مجھے اپنے چہرے کا کوئی گوشہ تھما رہی ہو جسے میں چاہتا چوم لیتا، آنکھوں سے لگا لیتا، دل پر پھیلا کر لیٹا رہتا۔۔۔ پھر ان رومالوں پر نقش یادیں ٹیبعید وسیمان گردانی جاتی تھیں۔ رومال کی حفاظت کرنی پڑتی

تھی۔ کوئی لڑکا کسی دوسرے کا رومال ہتھیانے کی کوشش کرتا تو طبل جنگ بج جاتا اور رومالوں کے دیوانے لہولہان ہو جاتے۔[۲۵]

ماحول اور ثقافت لغوی معنوں میں تو الگ الگ ہیں لیکن اپنے اصطلاحی معنوں میں یہ ایک دوسرے کے قریب پائے جاتے ہیں۔ ماحول کے تبدیل ہونے سے ثقافت میں تبدیلی یقینی بات ہے۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ماحول کا تعلق بیرون سے ہے اور ثقافت کا تعلق اندرون سے ہے اور اس کی وضاحت ہمیں ناول میں ان سطور میں ملتی ہے:

اپنے کمرے میں جاکر غسل کیا۔ میلے کپڑوں کی ایک ٹوکری بھر کر واشر میں ڈال آیا۔ کافی میکر سے ایک کپ کافی بنائی ور ٹوسٹر سے دو سلائس گرم کر کے ان پر شہد لگایا اور واپس کمرے میں آگیا۔[۲۶]

اب تصویر قدرے واضح ہے پاکستان کے دیہات کا جوان جو ناشتے میں تل لگے پراٹھے جو کہ دیسی گھی سے تر کیے گئے ہوں، گڑ والی چائے دیسی مرغی کی یخنی کے ساتھ نوش کرتا ہے، ماحول کے تبدیل ہونے کی وجہ سے کتنی بڑی تبدیلی اس کے ناشتے میں آچکی ہے۔

حقیقت پسندی کے معنی مختلف ثقافتوں میں الگ الگ ہیں۔ جب سلیم کی کہانی کو یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ امریکہ کا حقیقت پسند قاری اس کہانی میں موجود صحیر العقول واقعات کو پسند نہیں کرے گا۔ ہمارے ہاں حقیقت پسندی سے مراد حقائق کا بیان ہے حقیقت پسندی کے معنی کسی سطح پر جاکر عقل کے ساتھ جڑتے ہیں اور یہیں سے مختلف ثقافتوں میں موجود حقیقت نگاری کے معنوں میں انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں مذہب کو اہمیت حاصل ہے۔ ہم حقیقت کو مذہبی دائرے میں رہ کر لاگو کر رہے ہوتے ہیں جب کہ کسی دوسرے (دوسری ثقافت کے باشندے) کے لیے یہ سارا عمل ہی صحیر العقول ہوتا ہے۔

ہماری ثقافت اور سیاسی وسماجی روایت میں ایک اہم عنصر فارغ البالی کے زمانے کا ہے۔ یہ ایک دل کش عنصر تو ہے لیکن ہمارے زوال کا مغلوں کی حکومت کے جانے کا بھی یہی عنصر سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔ ہم اچھے دنوں میں خوب عیاشی کرتے ہیں اور مستقبل کے بارے میں بے فکر ہو کر لمبی تان کر سوئے رہتے ہیں۔ یہ بات ضروری تو نہیں ہے کہ ثقافت میں صرف خوبیاں ہی خوبیاں ہوں، برائیاں بھی ثقافت کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں اور ثقافت کے عروج یا زوال میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ بادشاہوں کے مشاغل اور ان کے شوق پر مشتمل ایک طویل فہرست موجود ہے۔ غالب نے ایک فرد کو کہا 'دیکھئے صاحب اگر آپ نے لکے (کبوتر) نہ رکھے ہوتے تو آج دلی کی یہ حالت بالکل نہ ہوتی' بادشاہوں کا زمانہ چلا گیا انگریزوں سے ہم مار کھا چکے لیکن آج بھی اس عیاشی اور شوق بازی سے باز نہ آسکے۔ ہمارا ہر ثقافتی فرد وقت ضائع اور پیسہ اڑانے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ہے۔ اربوں روپے کے عربی نسل کے گھوڑے درآمد کروائے جاتے ہیں۔ ہاتھی کے دانتوں سے نمائش کی جاتی ہے ریچھ کی خال سے جوتے بنوائے

جاتے ہیں۔ مرغوں کی لڑائیوں میں جوا لگاتے ہیں۔ بٹیروں کو سونے کی کڑیاں پہناتے ہیں۔ کبوتر کی بازی پر لاکھوں روپے لگا دیتے ہیں۔ اس طرح آدھی سے زیادہ عوام یا تو کوئی نہ کوئی شوق کر رہی ہوتی ہے یا کسی شوق کی خواہش دل میں رکھے بیٹھی ہوتی ہے۔ اب ذرا اس کو ناول کے سیاق میں دیکھیے:

> ابو جی کو مال مویشی اور چرند پرند پالنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے اس شوق کا کچھ حصہ مجھے بھی ورثے میں ملا۔ میں بھی کبھی کوئی طوطے رکھ لیتا کبھی لقے تو کبھی مرغیاں۔ دسویں جماعت میں میرے پاس کچھ اور چیزوں کے علاوہ ایک مرغی بھی تھی۔۔[۲۷]

رحم دلی اور حساس پن دونوں جذبے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں لیکن ان کی ایک حد متعین کر لی جائے تو بہتر ہے ورنہ حد سے زیادہ حساسیت اور آؤ اوچ ہائے کرتے رہنا صحت مندانہ سرگرمی بالکل نہیں ہے۔ ہماری ثقافت میں تو جان بوجھ کر سخت دلی کا عنصر ڈالا گیا ہے اور ہمارے سماجی رتبے کو ٹھیس پہنچائی گئی ہے۔ ناول ساسا میں اس تناظر کو دردناک صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک طویل اقتباس ملاحظہ ہو:

> ۔۔۔۔۔ جینی اس لیے کہ جینی نے معلوم نہیں کیوں خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا لیا تھا کیوں کہ اس کا ساسا کی بیماری پر رونا اور ہم سے بھی دھاڑیں مارنے کی توقع کرنا۔۔۔۔ اگر یہ میرا گاؤں ہوتا تو اب تک بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر ساسا کو حلال کیا جا چکا ہوتا۔ پھر موزی مرض وہ بتا رہی تھی وہ یہ تھا کہ ساسا اونگھ رہا تھا۔[۲۸]

آگے چل کر ناول نگار راوی کو شامل کرتے ہوئے تقابل کرتے ہیں:

> چند ہی روز پہلے میں نے ایک خبر پڑھی تھی۔ تھر میں قحط سالی سے قریب دو سو بچے مر گئے تھے۔ کچھ ماؤں کے رحموں میں جب کہ بہت سارے گودوں اور پنگھوڑوں میں اور میں تھا کہ ایک پرندے کو OverEating یا OverFeeding کا علاج کروانے ایک بہت ہی صاف ستھرے اور جدید قسم کے ہسپتال میں آ کر مصنوعی سنجیدگی کا ڈھونگ رچائے بیٹھا تھا۔[۲۹]

ناول نگار نے مندرجہ بالا اقتباس میں ہماری ثقافتی زبوں حالی کو ایک تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے کہ جہاں ایک طرف ہمارے ہاں اس قدر شدید قحط ہے کہ بچے ماؤں کے پیٹ میں مر رہے ہیں جب کہ دوسری طرف ایسی ثقافتی اقدار ہیں کہ پرندوں کے لیے ایک جدید قسم کا ہسپتال موجود ہے اور ایمرجنسی کے لیے ایمبولنیس کی سہولت بھی۔

پیری مریدی کا ایک باقاعدہ سلسلہ ہماری ثقافت کا اہم حصہ ہے جس کا واضح مقصد اصلاح نفس اور تربیت انسان ہے کیوں کہ صوفی انسان دوست ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی انسان دوستی کی طرف مائل کرتا ہے۔ کچھ کراماتی بزرگ بھی آتے رہے ثقافت میں کچھ نے یقین کیا اور کچھ نے بے یقینی کا اظہار کیا۔ جس کی مراد پوری ہوئی وہ عقیدت

مند بن گیا۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اب تعویذ گنڈے، جادو اور بہت سے شعبہ باز بھی آ گئے ہیں۔ ایک بڑی تعداد میں لوگ ان کے مقلد ہیں۔ ناول ساسا میں روزہ پیر کا کردار بھی اس ثقافتی پس منظر پر مشتمل ہے۔

پاکستان کی لوک داستانیں وہ خزانہ ہیں جن میں ہمارا کلچر مکمل تصویر کی شکل میں موجود ہے لیکن اب ہم میں سے بیش تر ان لوک داستانوں کے نام سے بے بہرہ ہیں فتوے کا عنصر ہمارے کلچر میں بہت حاوی ہے۔

ناول نگار نے اس کے محور تک پہنچنے کی کوشش کی ہے:

> ۔۔۔۔بالغوں کے نصاب میں جو کتاب سب سے زیادہ دل چسپ تھی اس کا عنوان تھا 'پاکستان کی لوک داستانوں کی ملکائیں' بزرگ تو اس کتاب کو پڑھ کر درخانئی، سسی، ہیر، اور صاحبان وغیرہ پر بے حیائی کے فتوے لگا دیتے تھے۔ ہیر کے لیے 'کھلاایس پیوکوں' کہتے اور کیدو کو 'جوان د اپتر' قرار دیتے۔۔۔۔ [۳۰]

ڈاکٹر وزیر آغا کی تعریف کے مطابق ایجادات اور ٹیکنالوجی بھی ثقافت کا حصہ ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کو ثقافت کے تشکیلی عناصر میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں اگر ہم ایک سادہ سی مثال موبائل فون کی لے لیں تو موبائل فون سے پہلے محبوب دور دراز کا کم ہی ہوتا تھا قریبی گاؤں یا محلے کا زیادہ ہوتا تھا جس سے گا ہے بگا ہے نین مٹکا بھی ہو جاتا تھا اور میلوں ٹھیلوں میں تحائف کا تبادلہ بھی اور اس عمل میں کسی سہیلی کی معاونت بھی مل جاتی تھی۔ دو پہر میں یارات کے پچھلے پہر کو نہر کے کنارے یا کھیت کی نرم گھاس میں ملاقات بھی ہو جاتی تھی اور پھر لمبے عرصہ تک اس ملاقات کی یاد تازہ کی جاتی۔ چاند کو دیکھ کر آہیں بھری جاتیں اور ستاروں سے باتیں کی جاتیں۔ پھر ٹیلی فون آ گیا محبوب نے اٹھالیا تو وارے نیارے محبوب کی ماں نے اٹھالیا تو غلطی سے فون مل گیا۔۔۔ اب تو واٹس ایپ اور ویڈیو کال کا زمانہ ہے۔ چوبیس گھنٹے راز و نیاز کی دل کش باتیں کی جاسکتی ہیں۔ محبوب کے حسن شتابی اور جمالیاتی پیکر کا دیدار کیا جاسکتا ہے۔ کھلی لہراتی زلفوں کو رات سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ محبوب کی چمکتی آنکھوں سے محبت کا دیدار کیا جاسکتا ہے۔ یہ نیا بننے والا ثقافتی منظر نامہ ہے جس کو عام الفاظ میں گلوبل ولیج کہا جاتا ہے لیکن افسوس ابھی تک یہ ٹیکنالوجی لمس سے محروم ہے۔

ہر علاقے اور ملک کی ثقافت کی انفرادیت ہوتی ہے جس طرح چین کے لوگ تحفہ دینا اور لینا پسند کرتے ہیں اس طرح پاکستان کی کشمیری چادر، کوہاٹی چپل سرحد کی ٹوپی خاص ہیں جن کو تحفہ کے لیے استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ یہ تحفہ امریکہ اعظم کو بھی پیش کیے جاتے ہیں لیکن بدلے میں ہمیں چاکلیٹی رنگ کے ڈرون نصیب ہوتے ہیں:

> پاکستان کے غریب بچے ہمارے لیے ٹوپیاں بنا کر اور شالیں بن کر بھیجتے ہیں۔ ہم ان کے لیے ڈرون بھجواتے ہیں اور یہ کہ پاکستان کے وہ نوجوان جو ہمیں گلاب کے پھول بھیجتے ہیں، ہم انہیں ڈرون کا تحفہ

بھیجتے ہیں اور پاکستان کے وہ بزرگ جو ہمیں دعائیں دیتے ہیں ہم ان کی پھیلی ہتھیلیوں پر ڈرون کی آگ رکھ دیتے ہیں۔۔۔[۴۱]

گاؤں اور شہر کے ثقافتی مزاج میں بہت فرق ہوتا ہے۔ شہر میں لوگ ہمیں ہمارے اپنے نام سے جان رہے ہوتے ہیں جب کہ گاؤں میں ایک ایسی شان دار ہم آہنگی ہوتی ہے کہ لوگ ہمیں ہمارے باپ دادا کے نام سے جانتے ہیں۔ شہر میں اگر ساتھ والے گھر میں کوئی بیمار ہے تو ہمسائے کو علم ہی نہیں ہوتا جب کہ گاؤں میں پورا دن دروازہ کھلا رہتا ہے جو ملاقات کے شوق کی علامت ہوتا ہے۔ گاؤں میں کوئی بیمار ہو جائے تو پورے دن لوگوں کا تانا بانا لگا رہتا ہے۔ چچی جا رہی ہے تو ماسی آرہی ہوتی ہے۔ اس میں ایک حیران کن بات یہ ہے کہ ہر آنے والا اپنا ٹوٹکہ لیے آرہا ہوتا ہے اور ہر بیماری کی جڑ بہت بتائی جاتی ہے:

آپ لاکھ کہیں کہ سر میں درد ہے وہ آپ کو سر درد کی بنیادی وجہ قرآن و حدیث سے ثابت کر کے پیٹ کی وہ بیماری بتاتے جو نہ صرف سر درد کا باعث تھی بلکہ ڈھائی سو سال پہلے اس کی چکی کی ایجاد کا بھی۔[۴۲]

ثقافت میں تبدیلی آہستہ آہستہ وقوع پذیر ہوتی ہے لیکن بعض اوقات ایسی سخت صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ ثقافت کو مجبوراً اور فوراً اس تبدیلی کو قبول کرنا پڑتا ہے:

۔۔۔ مگر یہ ارض پاک پاک ہونے کے عمل سے گزر رہی ہے۔ میرا ملک حالت جنگ میں ہے ۔۔۔ زمین پر اتنے بم پڑے کہ اس کی کوکھ بانجھ ہو گئی۔ ہواؤں میں زہر گھولا گیا۔ ہمارے پنچھی کسی اور دیس کو منہ کر گئے بزرگ ٹھلدی بٹیروں کی سواری کی دعا کرتے ہیں جو ان ترقی یافتہ ملکوں کو جوق در جوق چلے جاتے ہیں۔ بچے چھوٹے چھوٹے صحنوں میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہر طرف گھٹن ہی گھٹن ہے۔[۴۳]

ظلم اور آنسو کب تک برداشت کئے جا سکتے ہیں؟ ظلم کی عادت اس قدر ہو جاتی ہے کہ ظالم کا ڈر ہی ختم ہو جاتا ہے اور آنسو اس قدر دل کو نچوڑتے ہیں کہ یا تو آنسو نکلنا ہی بند ہو جاتے ہے یا دل پتھر کا ہو جاتا ہے۔ محولا بالا اقتباس میں جو صورت حال ہے وہ وطن عزیز کی ۹/۱۱ کے بعد کی صورت حال ہے جب ہمیں باقاعدہ انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ نقصان ہمارا سیاسی، سماجی، عالمی سطح کے ساتھ ساتھ ثقافتی سطح پر بھی ہوا۔ ہم بحیثیت مجموعی اس قدر بے حس و سخت دل ہو گئے کہ روز روز کی اموات اب ہمارے حساس کو منتشر نہیں کرتی ہیں اور ہم اپنی چال چلتے ہوئے معاملات زندگی نباہ رہے ہیں۔ کوئی مرے ہماری بلا سے۔ اس سے زیادہ ثقافتی زوال کی صورت اور کیا ہو سکتی ہے!

ایک جانب امریکہ کی اظہار یہ تہذیب ہے جس میں آپ آزادی اظہار کے ساتھ ساتھ آزادی عمل سے بھی لطف اٹھا سکتے ہیں۔ یہ اس ثقافت کا خاصہ بھی ہے۔ جس طرح جینی کی والدہ لیز بین ہے اور دوستوں کو ڈیٹ کرتی ہیں ۔ یہاں اس ثقافتی رویے کو ناول نگار ہمارے ثقافتی رویے کے ساتھ الگ تناظر میں ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک جانب تو وہ امریکہ میں لیسبنازم تذکرہ کرتے ہیں تو دوسری جانب ہمارے سامنے ایک واقعہ ہے جو ثقافتی اقدار کے خلاف بھی ہے اور محبت کے عروج کی دلیل بھی ہے۔ جب عامر ایک ہجڑے سے محبت کرتا ہے اور شادی کرتا ہے اس صورت حال میں محبت ایک استعارے کی طرح بلند ہونا شروع ہوتی ہے۔ خواجہ سرا ہمارے معاشرے کا ایک حصہ ہیں لیکن یہ انتہائی نچلی سطح پر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں لیکن ان کے ہاں بڑا نظام پایا جاتا ہے۔ ان کی اپنی ایک کوڈورڈ پر مشتمل زبان ہوتی ہے رات کو لوگوں کے لیے سستی تفریح کا موقع دیتے ہیں ناچ گانا کرتے ہیں خوشی و غمی کے موقع پر پہنچ جاتے ہیں۔ غوری نامہ بلاگ میں ایک واقعہ ان کے متعلق لکھا ہوا کہ راول پنڈی کے ایک پوش علاقے میں کھنہ پل کے نزدیک خواجہ سراؤں نے اپنا ایک SubHeadQuarter بنا رکھا تھا۔ چوں کہ وہ جگہ ایک محلہ کا حصہ تھی اور لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ اس لیے ناپسندیدگی کی حامل تھی۔ وہ ایک پلازے کی اوپری منزل پر رہائش پذیر تھے کہ کسی نے باہر سے تالا لگا دیا۔ خواجہ سراؤں نے اوپر سے گالم گلوچ شروع کی اور چوکی دار کو ایسی سنائیں کہ وہ کان بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ایک فون کرنے پر قریبا ۲۰۰ خواجہ سرا اکھٹے ہو گئے اور طوفان بد تمیزی بلند ہونے لگا۔ اتنے میں پولیس بھی آ پہنچی اس کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ ایک V8 پجیرو میں بڑے گرو کی آمد ہوتی ہے جس کے ساتھ ٤ باڈیگارڈ موجود ہیں۔ [۳۴]

گویا بے شک یہ کم تر سطح پر موجود ہیں لیکن ان کے ہاں زندگانی کا بھرپور نظام موجود ہے۔ عامر اپنی محبت حاصل کر لیتا ہے لیکن اس کا محبوب ایک بم دھماکے میں اس سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح محبت کے استعارے سے یہ بات واضح کی گئی کہ یہ بم حملوں جیسی ثقافتی تبدیلی نے کس قدر ہمیں اندر سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔

ثقافتی حوالے اور مذہبی تناظر میں کوئی بات حتمی صورت میں نہیں کی جا سکتی ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک ثقافت مذہب کا ہی عکس ہوتی ہے اور کچھ کے مطابق مذہب کے ایک طریقہ کار کا نام ثقافت ہے۔ ناول میں ایک اور ثقافتی عمل ملتا ہے۔ ایک طرف امریکہ کا معاشرہ ہے جہاں لوگ بغیر شادی کے ہی ایک ساتھ رہنا شروع کرتے ہیں جب کہ ہمارے معاشرے میں دین اسلام کی رو سے یہ معاملات نبھائے جاتے ہیں جس میں حلالہ کا طریقہ ہے۔ اگر فریقین میں طلاق ہو جائے تو عورت کسی اور مرد سے نکاح کر کے اس کو اپنی مٹھاس چکھائے اور پھر وہ آدمی اپنی رضامندی سے اسے طلاق دے تب جا کر وہ عورت پہلے خاوند کے پاس جا سکتی ہے۔

ثقافتیں آپس میں لین دین بھی کرتی ہیں اور ایک ثقافت کی ذیلی چیزیں دوسری ثقافت سے تبدیل یا ہم آہنگ بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اب ہم ذرا گرد و نواح کو دیکھیں تو ہمیں بہت سی ایسی چیزیں نظر آئیں گی جن کو ہم کبھی بھی اپنی ثقافت کا حصہ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ناول میں ایک جگہ Candle Light Dinner کا ذکر ہے تو ہماری ثقافتی روایت میں تو اس چیز کا تصور ہی موجود نہیں ہے۔ چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے ہماری محبت تو اس اصول پر عمل کرتی ہے لیکن اب اہم اس Dinner سے روگردانی بھی نہیں کر سکتے ہیں کیوں کہ یہ اب ہماری روز مرہ کی رومانوی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔

دہشت گردی ایک ایسا عنصر ہے جو ثقافت کے زوال کا باعث ہوتا ہے لیکن ہماری بد قسمتی اس قدر زیادہ ہے کہ دہشت گردی ہماری ثقافت کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ ہماری بین الاقوامی پہچان اور پوری دنیا کا ہم پر شک کرنا، اس کی بھی بڑی وجہ کچھ خاص عناصر کی غلط پالیسیاں، ذاتی مفادات کے چکر میں پوری قوم کو جھونک دینا، یہ وہی اقدام تھے جن کا خمیازہ آج ہم دہشت گردی کی صورت میں بھگت رہے ہیں کبھی ۹/۱۱ کے واقعے کے ماخذ پاکستان سے مل رہے ہوتے ہیں تو کبھی اسامہ بن لادن کی دستیابی پاکستان سے ہوتی ہے۔ کبھی امریکہ میں ہونے والے بم دھماکے کی تحقیقات میں معلوم پڑتا ہے کہ اس کی منصوبہ بندی پاکستان کے شمالی علاقے میں کہیں ہوئی۔ اس میں جہاں کچھ قصور ہمارا ہے تو کچھ ہمارے اوپر مسلط مفادی حکمرانوں کا۔

کھانے، پکوان اور جانوروں کو ذبح کرنے کے طریقے الگ ہوتے ہیں چاہے وہ دو مختلف مسلم معاشرے ہی کیوں نہ ہوں اور وہ حلال طریقے سے ذبح کرتے ہوں۔ ایسے معاملوں میں ثقافت مذہب کے تابع رہ کر کام کرتی ہے۔ جس طرح کا معاشرہ ہوگا جو مذہب کثرت میں ہوگا ثقافتی اصول اسی بنیاد پر استوار ہوتے چلے جائیں گے:

> ---- میڈی کو جانوروں اور مرغیوں کو ذبح کرنے کا صحیح طریقہ بھی بتانے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ مرغی کو اگر ذبح کرنے کے بجائے سر پر ہتھوڑا مار کر جھیل لیا جائے جیسے یہاں ہوتا ہے تو اس کا گوشت خون کی آلائش سے کم نہیں ہوتا اسی لیے بہت سی ذہنی و جسمانی بیماریوں کا موجب بنتا ہے۔ [۳۵]

تولید ایک اہم موضوع ہونے کے ساتھ ہی ایک ایسا عمل ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تولید جس سے مرد جانداروں کو آپس میں اختلاط کر کے اپنی کمیونٹی اور تعداد میں اضافہ کرنا ہے۔ غار کے دہانے پر کھڑا شخص اپنا ایک کنبہ رکھتا تھا فکر انسانی اور نسل انسانی کا سفر چلتا رہا کہ وہ زرعی سماج میں داخل ہو گیا۔ اب زرعی سماج میں کام کرنے کے لیے انفرادی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کنبہ زیادہ افراد پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ پاکستان کا بڑا حصہ زراعت سے منسلک ہے اس لیے یہاں پر تولید کا عمل بھی تیز گویا اب ضرورت تو نہیں رہی لیکن زیادہ بچے جننا اور زیادہ بڑا کنبہ کرنا ہماری ثقافت کا حصہ ہے۔ دوسری ثقافتوں میں بہت سارے تجربات کیے جاتے رہے ہیں۔ وسائل کو

ملحوظ خاطر رکھ کر تولید پر پابندی لگائی گئی اور اس کے فوائد و نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کیا گیا۔ بھارت جیسے کثیر آبادی والے ملک میں نسل بندی جیسے مہم کا آغاز کیا گیا۔ پاکستانی ثقافت کی اساس دین اسلام کے ساتھ ملحق ہے۔ اسلام ہمیں زیادہ کنبہ رکھنے کو پسندیدہ عمل بتاتا ہے کیوں کہ ہر جان کو رزق دینے کا وعدہ خدائے رب العزت نے کر رکھا ہے۔ سماج دان یہ بات تسلیم کرتے ہوئے اس بات کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ دنیاوی وسائل تیزی سے کمی کا شکار ہوتے جا رہے ہیں اور دنیا کو قحط کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ ناول سلسا میں خادم صاحب کے ذریعے ہمیں فلسفہ رد تولید کا درس ملتا ہے کہ ہم اپنے بچے پال پوس کر اس بے رحم دنیا کے سامنے ڈال دیتے ہیں۔ تولید کا فلسفہ سیاق و سباق کے حوالے سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر دیہی ماحول میں اب بھی ایک باپ کی اولاد ۶۔۱۰ نفوس پر مشتمل ہے اور شہر میں یہ تعداد ا۔۳ تک رہ جاتی ہے۔ حکومتی سطح پر بھی تولید کو کنٹرول کرنے کے مناسب اقدامات کیے گئے ہیں۔ بچے دو ہی اچھے، پانچ سال کا وقفہ، دو سال کا وقفہ جیسی باتیں روزانہ کی بنیادوں پر سننے کو ملتی ہے لیکن ہمارا ثقافتی مزاج ہی ایسا ہے کہ تولید و کنبے کو وسیع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ناول کے متن میں ہی ثقافت کو سخت کیا گیا ہے جو ناول نگار کی ذہنی فکر کی عکاسی بھی ہے:

> اس کے اور میرے بیچ ثقافتوں کے دو براعظم حائل تھے، جو برسات کے مینڈکوں کی طرح ام دنوں میں نظر نہیں آتے مگر جوں ہی حالات کروٹ لیتے ہیں اس شدت سے دھاڑتے چنگھاڑتے ہیں کہ محبت کے کانچ محل میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔[۳۶]

بڑے ادب کی پہچان ایک یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے متن کے اندر ایک اور متن موجود ہوتا ہے اس کے اندر علامتوں کا ایک بھرپور نظام ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس اس بات کا علم برادر ہے کہ کس طرح ناول نگار نے ثقافتی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے محبت کا سامنا کرنے والی مزاحمت کو بیان کیا ہے۔

پاکستانی ثقافت کی اساس جہاں بھائی چارہ، محبت، امن و آشتی ہے وہیں پر مذہبی بنیادوں پر کچھ اختلافات بھی ہیں جس کا اندازا اس سے لگایا جا سکتا ہے:

> اس سے شادی کیوں نہیں ہو سکتی؟
>
> وہ شعیہ ہے! میں نے اٹل انداز میں کہا۔[۳۷]

جب کہ امریکی ثقافت میں ایسا کم ہی خاطر میں آتا ہے محبت کرنے والے آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور خاص عمر کے بعد اپنے فیصلے خود کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ ثقافتی تناظر میں ایک بہت خاص شے ثقافتی عمل ہوتا ہے۔ ناول نگار نے طنزیہ انداز میں ہمارے ثقافتی عمل کی نشاندہی کی ہے:

> اس جہاں میں کتنے لوگ ہیں جنھیں دولت جوڑنے، کھانے پینے، دائرہ تولید وسیع کرنے اور مر جانے کے علاوہ کسی شے کی کوئی پرواہ نہیں؟[۳۸]

مختصر یہ کہ مصنف نے ناول میں ثقافتی حوالوں سے جا بجا تہذیبی اختلافات کو واضح کیا ہے چونکہ ثقافتی اختلافات ہی تہذیبی اختلافات کی بنیاد ہوتے ہیں اسی لئے ثقافتی حوالوں سے انکار ممکن نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر (اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن، ۱۹۸۵ء)، ص ۴۲۔

۲۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری، جلد دوم (لندن: آکسفورڈ کلیر بنڈن پریس لندن)، ص ۱۴۸۲۔

۳۔ ای۔ ڈی۔ وارڈ، بی ٹیلر، پریمیٹو کلچر، جلد اول (لندن: جان میری ٹی ڈی، ۱۸۷۱ء)، ص ۱۔

۴۔ آر۔ لنٹن سی ڈی، دی سائنس آف مین ان دی ورلڈکرائسس (نیویارک: کولمبیایونیورسٹی پریس، ۱۹۴۵ء)، ص ۱۴۔

۵۔ برونس لامانوسکی، اے سائنٹیفک تھیوری آف کلچر (نیویارک: یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا پریس، ۱۹۴۴ء)

۶۔ انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز، جلد سوم (نیویارک: میکملن، ۱۹۵۹ء)، ص ۱۲۱۔

۷۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ص ۵۴۔

۸۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، نوٹس ٹووارڈس دی ڈیفینیشن آف کلچر (فیبر اینڈ فیبر، ۱۹۲۷ء)، ص ۲۰۔

۹۔ فرانسس۔ ای۔ مرریل، سوسائٹی اینڈ کلچر (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۵۸ء)، ص ۲۰۔

۱۰۔ انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز، ص ۶۲۱۔

۱۱۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ص ۱۱۴۔

۱۲۔ حجتہ اللہ البالغہ، جلد اول (لاہور: قومی کتب خانہ)، ص ۲۸۴۔

۱۳۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، نوٹس ٹووارڈس دی ڈیفینیشن آف کلچر، ص ۲۷۔

۱۴۔ یس۔ ایم۔ یوسف، اسلامک کلچر (انسٹیوٹ آف اسلامک کلچر، ۱۹۷۸ء)، ص ۱۔

۱۵۔ فسٹل ڈی کولنگس، دی انشنٹ سٹی اے اسٹڈی آن ریلیجن، لاء اینڈ انسٹیٹیوشن، مترجم ولرڈ سمال، (نیویارک: بوسٹن لی اینڈ شیپرڈس، ۱۸۷۳ء)

۱۶۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم نذیر نیازی (لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۴ء، ص ۳۲۲۔

۱۷۔ ارچ فورمم،مین فار ہمسلف(نیویارک: فوکٹ پبلیکیشنز،۱۹۶۵ء)،ص۱۶۵۔

۱۸۔ ایڈون اے برٹ،فلسفہ مذہب،مترجم بشیر احمد ڈار(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۶۳ء)،ص۳۸۵۔

۱۹۔ شعیب رضوی،اسلامی ثقافت(لکھنؤ:النور پبلیکشنز،۱۹۶۷ء)،ص۳۴۔۳۵۔۴۵۔

۲۰۔ وزیر آغا،کلچر کے خدوخال(لاہور: مجلس ترقی ادب،۲۰۰۹ء)،ص۹۸۔۱۰۰۔

۲۱۔ شیر ازدستی، ساسا ،ص۱۲۔

۲۲۔ ایضاً،ص۱۸۔

۲۳۔ ایضاً،ص۲۰۔

۲۴۔ ایضاً،ص۲۱۔

۲۵۔ ایضاً،ص۲۶۔

۲۶۔ ایضاً،ص۲۷۔

۲۷۔ ایضاً،ص۳۲۔

۲۸۔ ایضاً،ص۳۲۔

۲۹۔ ایضاً،ص۴۱۔

۳۰۔ ایضاً،ص۵۸۔

۳۱۔ ایضاً،ص۴۷۔

۳۲۔ ایضاً،ص۸۰۔

۳۳۔ ایضاً،ص۹۱۔۹۲۔

۳۴۔ https.ghorinama|capch:789.com|17111395،بتاریخ یکم جنوری ۲۰۲۰ء، بوقت ۸:۵۴بجے

۳۵۔ شیر ازدستی، ساسا ،ص۱۳۶۔

۳۶۔ ایضاً،ص۱۸۳۔

۳۷۔ ایضاً،ص۱۸۵۔

۳۸۔ ایضاً،ص۲۲۲۔

باب چہارم:

ناول ساسا میں تہذیبی اختلافات

سیاسی اور مذہبی تناظر میں

باب چہارم:

ناول ساسا میں تہذیبی اختلافات سیاسی ومذہبی تناظر میں:

اختلاف ایک لفظ نہیں ہے بلکہ اختلاف ایک عمل کا درجہ رکھتا ہے اور اختلاف ہی وہ بنیادی عنصر ہے جس سے نئی اشیاء پیدا ہوتی ہیں نئے نظریات جنم لیتے ہیں گویا تاریخ فکر انسانی اپنے سفر پر گامزن رہتی ہے۔اختلاف اپنے لغوی معنوں میں تو یوں ہے کہ کسی بات کے انکار میں اپنا موقف بیان کرنا یا پھر اسے دلیل سے واضح کرنا یہ اختلاف کے لفظ کی بنیادی کسوٹی ہے۔

اختلاف تو شروع سے موجود رہا ہے شیطان کا انکار آدم ہو،انبیاء کے قصے ہوں،دیوی دیوتاؤں کی پہیلیاں ہوں اختلاف موجود رہتا ہے اختلاف انتہائی چھوٹی سطح پر بھی ہو سکتا ہے اور یہ بڑی سے بڑی سطح پر بھی ہمیں دکھائی دیتا ہے ایڈیسن نے بلب تب ہی ایجاد کیا جب اس نے سورج کی روشنی سے اختلاف کیا اسی وجہ سے اقبال نے پوری نظم لکھی جس میں اختلاف کا عنصر نہایت نمایاں ہے (تو چراغ آفریدی من چراغ آفریدم)۔ تخلیق کے سرچشمے کا گہرا تعلق بھی اختلاف کے ساتھ وابستہ ہے جب ایک تخلیق کار اختلاف پر آتا ہے تب وہ اپنے تخیل کو حرکت دیتا ہے اور مخالف رخ میں اپنی عمارت کو کھڑا کرتا ہے۔

ناول ساسا میں بھی جب ذکر آتا ہے امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کے ساتھ کئے جانے والے سلوک کے حوالے سے کہ کس طرح ۹/۱۱ کے بعد ان کو سخت وخوفناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس وقت ناول نگار ایک اختلاف پر اپنا موقف قائم کرتا ہے۔

اختلاف تن تنہا نہیں ہوتا بلکہ اس کے مخصوص تناظرات ہوتے ہیں چاہے اختلاف مذہبی تناظر میں ہو سیاسی تناظر میں معاشرتی تناظر میں روزمرہ کی زندگی کے تناظر میں یا معاشرتی ترقی کے تناظر میں گویا اختلاف اکیلا نہیں ہوتا بلکہ اس کا ایک مخصوص پس منظر ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ عسکری صاحب نے اپنے مضمون 'جدید عورت کی پرنانی' میں لکھا کہ بیسوی صدی کو جو بھی نام دے دیا جائے وہ نام میل کھا جاتا ہے لیکن کچھ عرصے بعد یہ نام تردید پر اتر آتا ہے اختلافات اور ان کے مخصوص تناظرات انسان کی زندگی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں اور ایک فکر سے وابستہ ہوتے ہیں چاہے وہ حق میں ہوں یا مخالفت میں میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی مثال تو جدیدیت اور اس کے بعد آنے والا مابعد جدید عہد ہے جس کے مفکرین کا سب سے اہم مقصد ہی اختلاف رہا جیسا کہ دریدا اختلاف کرتا ہے مرکز کی حاکمیت

سے اور کہتا ہے کہ حاشیے میں موجود اشیاء کو بھی مرکزی حیثت دے کر دیکھنا چاہیے اب اسی اختلاف سے منفی امتیاز اور تا نیثیت جیسے سوال ہمارے سامنے آنے لگ جاتے ہیں۔

اشیاء کو پرکھتے ہوئے یا ان پر بات کرتے ہوئے مختلف سوالات ذہن میں آتے ہیں ان کی بنیاد پر ہی تجزیہ جنم لیتا ہے یہی معاملہ اختلاف کے حوالے سے بھی ہے ایک بنیادی سوال ہے کہ اختلاف کیوں جنم لیتا ہے ؟اس کا تعلق کسی بھی ایسی سرگرمی سے ہو سکتا ہے جو استحصال پر مبنی ہے جس میں کسی اہم کا فائدہ اور کسی عام کا نقصان ہوتا ہو پر ایسی بات جو کسی دوسرے کے نزدیک غلط ہو پر ایسا عمل جس پر اجارہ داری کا شبہ ہوتا ہو اختلاف پیدا کر سکتا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں اختلاف کو ہر صورت اہمیت حاصل ہوتی ہے اگر معاشرے میں اختلاف کا عنصر نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اسے دبانے کی کوشش کی جارہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہاں بنیادی انسانی حق کو لوٹا جارہا ہے۔ محولا بالہ ہم نے اختلاف کے حوالے سے چند باتیں کی ہیں جن میں اختلاف کی اہمیت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اختلاف ایک ایسی سطح کا نام ہے جہاں سے نیچے کی جانب آیا جائے تو انسان راضی بارضا کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو چاہے اس کے ساتھ کرتے رہو وہ صبر و شکر سے کام لیتا رہے گا بجائے اس لیے کہ وہ اپنے بنیادی حق کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور اگر اس سطح سے ذرا اوپر کو چلا جاتا ہے تو وہ درو ہی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اس کا شمار سماج دشمن عناصر میں ہونے لگتا ہے یہاں سری بات ریاست کی زمہ داریوں پر آجاتی ہے اس میں فرد کا کوئی دوش نہیں ہوتا بلکہ یہ تو ریاست کی زمہ داری ہے کہ وہ پیدا ہونے والے اختلاف کو سمجھے اور اس کا درست حل نکالنے کی کوشش کرلے اس سے پہلے کہ معاشرہ ریاستی بغاوت کا شکار ہو جائے۔

انسان کی تاریخ تہذیبوں کی تاریخ ہے نوع انسانی کے ارتقاء کو دوسرے زاویے سے سوچنا مشکل ہے یہ کہانی تہذیبوں کی مختلف نسلوں کا احاطہ کرتی ہے جو قدیم سومیری اور مصری تہذیب سے شروع ہوتی ہے اور کلاسیکی، میو امریکی اور اسلامی تہذیبوں تک آتی ہیں اس کے علاوہ چینی وہند کی تہذیب بھی ماضی کے انسان کو وسیع ترین پہچان عطا کرتی رہی ہیں قوم کے لیے تہذیب ایک ایسی پہچان ہے جو عالمی سطح پر اس کی انفرادی حیثیت اور پختگی کا احاطہ کرتی ہے یہ تہذیب اقدار و روایات کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہے جیسی کسی قوم کی اقدار و روایات ہوں گی ویسی ہی اس قوم کی تہذیبی شناخت ہوگی یہ اقدار و روایات چونکہ مذہبی جغرافیائی، سیاسی و معاشی وسائل اور مسائل کے ساتھ اخلاقی و جذباتی ضروریات کے تحت تشکیل پاتی ہے اس لیے ان میں تنوع اور دوسری قوموں کی اقدار و روایات سے اختلاف ایک لازمی و ناگزیر امر ہے۔ انسان نے پتھر کے وحشی دور سے نکل کر دریاؤں کے کناروں پر اپنی تہذیبی زندگی کا آغاز کیا اور رفتہ رفتہ زرخیز میدانوں کی تلاش میں زمین پر پھیلتے چلے گئے۔ انسان کے ارتقاء کی یہ کہانی دراصل اقدار و روایات کی

تشکیل اور تہذیبی زندگی کے تعارف کی کہانی ہے کیونکہ جوں جوں انسان بڑھتا اور متموّن ہوتا گیا اس نے تہذیب میں بھی اتنی ہی ترقی حاصل کی اور پھر تہذیبی انفرادیت نے تہذیبی شناخت کے نظریے کو جنم دیا۔

ڈارون کے مطابق انسان کا ظہور پہلے پہل افریقہ سے ہوا بعض دانش وروں کے مطابق نیم حیوانی انسانی جزائر مشرق الہند میں نمودار ہوئے اور روس سے دوسرے ممالک کو گئے۔ جاوا کی کھوپڑی کا بندر مانس آج سے پانچ لاکھ برس پہلے کا بتایا جاتا ہے جبکہ پیکن کی کھوپڑی ڈھائی لاکھ سال پرانی ہے جدید ترین تحقیقات کی رو سے قدیم ترین بندر مانس پنجاب کی سطح مرتفع پوٹھوہار کا باسی تھا۔[1]

دیگر آراء کے مطابق آج سے پانچ لاکھ سال پہلے کے انسانی ڈھانچوں کے جو حصے ملے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ سیدھا چلنے والی انسانی نسل کا آغاز کینیا سے ہوتا ہے اس کے بعد یہ نسل آہستہ آہستہ یورپ اور ایشیاء کی جانب پھیلی یہاں تک کہ ڈھائی تین لاکھ سال کے عرصے میں ساری دنیا میں پھیل گئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ سمندر پھیلتا چلا گیا اور زمین تقسیم ہوتی چلی گئی جس کی وجہ سے مختلف ممالک وجود میں آئے جنوب مشرقی ایشیاء کے جزائر بڑے براعظم سے ملحق تھے وہاں ایشیاء سے کئی انسانی گروہ گئے اور آباد ہو گئے اپنی انسانی آبادیوں کے چار لاکھ سال پرانے آثار جاوا کے جزیرے سے ملے ہیں۔ وہاں سے ساڑھے تین لاکھ سال کے دوران انسان کشتیوں میں سوار ہو کر ۱۶۰۰۰ BC میں آسٹریلیا پہنچا جہاں سے بعد میں جنوبی امریکہ کی طرف نکل گیا شکار کی تلاش میں الاسکا اور سائبریا جیسے کٹھن و مشکل علاقے انسانی وجود سے آشنا ہو گئے۔

انسانی پھیلاؤ کے متعلق یوں تو کافی نظریات پائے جاتے ہیں جن میں سے دو بہت اہم ہیں اول تو یہ کہ انسان کی نشو و نما پیدائش اور ترقی ایک ہی جگہ ہوتی رہی اور وہ لہروں کی صورت میں دنیا میں پھیلتا چلا گیا جبکہ ایک دوسرے نظریے کے مطابق افریقہ میں پیدا ہونے والی پہلی قسم کا انسان اپنی اس ساخت میں تمام دنیا میں پھیل گیا اور پھر رفتہ رفتہ اس نے اپنے جغرافیائی و طبعی حالات و ضروریات، رسم و رواج، طرز زندگی اور شہر اقدار و روایات اور عقائد کی تشکیل کی۔

یہ اقدار و روایات کسی تہذیب کی بنیاد بنے تو خود بخود یہ تمام اجزاء بھی تہذیب کا حصہ بن گئے اب چونکہ ہر علاقے یا خطے کی جغرافیائی و طبعی حالات و ضروریات اس کے ساتھ ہر خطے کے جغرافیائی، مذہبی، نظریاتی، جذباتی، اخلاقی، سماجی اور معاشرتی حالات و واقعات میں تنوع تھا تو ان اقدار و روایات کا تنوع اور دوسری روایات و اقدار سے متضاد یا مختلف ہونا ایک لازمی امر تھا۔ سمیرین کو دنیا کی قدیم ترین تہذیب اور قوم تصور کیا جاتا ہے۔ جو ۵۰۰۰ سال قبل مسیح میں دجلہ و فرات کے میدانوں کی زرخیزی کے باعث یہاں پر آباد ہوئے اسی تہذیب کو

Mesopetania کانام بھی دیا جاتا ہے جس کی حدود آرمینا کے پہاڑوں سے لے کر خلیج فارس تک محیط ہوں۔ شام، بابل، عراق اور ایران کے علاقے اس ضمن میں اہم ہیں۔

Mesopetonia اور مصر کے بعد سب سے بڑی تہذیب یونان میں نظر آتی ہے جو ۹۰۰ قبل مسیح میں ابھری اور اسی تہذیب پر پوری مغربی تہذیب کی بنیاد ہے۔ یہی تہذیبی سفر رومن تہذیب کے چراغوں کو روشن کرتا ہوا DarkAges اور نشاۃ الثانیہ کے عہد سے گزر کر جدید یورپ تک پہنچا ہے۔ تہذیب کا یہ سفر جن جن علاقوں سے ہو کر گزرا وہاں کے حالات و واقعات کے اثر قبول کرتا ہے اور یہ اثر ان قوموں کے اقدار و روایات کی صورت میں ظہور پذیر ہوا، مختلف حالات و واقعات نے عقائد اور ضروریات کے تحت تشکیل پانے والی روایات و اقدار کے تحت تہذیبوں کے جدا جدا رنگوں نے دنیا کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا اور رفتہ رفتہ تہذیبی شناخت کا مسئلہ بہت شدت سے سامنے آنے لگا۔ مورخین کے نزدیک پانچ ایسی تہذیبیں ہیں جن کو مستحکم کی سند دی جاسکتی ہے۔

۱۔ مغربی عیسائی تہذیب (یورپ امریکہ)

۲۔ آرتھوڈوکسی عیسائی تہذیب (روس جنوب مشرقی یورپ)

۳۔ ہندو تہذیب (برعظیم)

۴۔ مشرق بعید کی تہذیب (وسط ایشیاء، منگولیہ، چین)

۵۔ اسلامی تہذیب

یہ تہذیبیں کسی نہ کسی صورت میں آج بھی موجود ہیں اور زندگی سے بھرپور ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیبوں پر گہرے اثرات رکھتی ہیں ان پانچوں تہذیبوں میں سوائے اسلامی تہذیب کے باقی تمام تہذیبیں موروثی ہیں یعنی ایک تہذیب کی جائے مرگ سے دوسری تہذیب نے جنم لیا اور وہ پھلی پھولی لیکن صرف اسلامی تہذیب ایسی ہے جس نے کسی دوسری تہذیب سے جنم نہیں لیا اسلامی تہذیب جہاں دوسری تہذیبوں سے متاثر ہوتی ہے وہیں اس کا اثر بھی دیگر تہذیبوں پر پڑتا ہے اس تہذیب نے نا صرف اپنے سے پہلی بلکہ اپنی ہم عصر تہذیبوں کو بھی متاثر کیا اور دوسری تہذیبوں کے مجموعی خدوخال یہیں سے آملتے ہیں۔

ناول ساسا میں ہمیں اختلافات کی صورت میں دو (۲) تہذیبیں ملتی ہیں ایک اسلامی تہذیب اور دوسری امریکی تہذیب ان کے ہاں بے شمار اختلافات موجود ہیں لیکن کچھ قدریں مشترک بھی ہیں پہلے جن تہذیبوں پر ہم نے سرسری بات کی اس کا مقصد اس بات کی وضاحت کرنا تھا کہ انسانی فکر کے سفر کے ساتھ ساتھ تہذیبوں کا سفر جاری رہا ہے تہذیبیں جہاں ایک طرف لین دین کرتی رہیں وہیں پر مختلف حالات و حوادث کی وجہ سے ان میں کچھ ایسی

خصوصیات آگئیں جو دوسری تہذیبوں کے پاس نہیں تھیں اب ہم ذرا تھوڑی سی روشنی اسلامی تہذیب پر ڈالتے ہیں بلا شبہ ناول کا تھیم پاکستان اور امریکہ کی لوکیل میں قائم کیا گیا ہے۔ پاکستان جہاں ایک اسلامی ملک ہونے کی وجہ سے اسلامی تہذیب کا علمبر دار ہے وہیں پر یہ برصغیر کا بھی حصہ ہے اور برصغیر دنیا کا اہم تہذیبی خطہ ہے خصوصاً ہندومت بدھ مت کے حوالے سے۔ مورخین نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اکثر قدیم علوم و فنون اور اقدار و روایات اسلامی تہذیب کے ذریعے مشرقی و مغربی یورپ کی تہذیبوں سمیت تمام تہذیبوں میں شامل ہوئے چینیوں اور ہندوؤں کی تہذیبیں ایک دوسرے کی تہذیبوں کو اتنا متاثر نہیں کر پائیں جتنا اسلامی تہذیب نے کیا ہے۔

اسلامی تہذیب پہلے آٹھویں صدی میں وسط ایشیاء سے بحر اوقیانوس تک پھیلی جس میں ایشیاء کے کوچک کا بیشتر حصہ، سارا شمالی افریقہ، اور بحریہ روم کے اکثر جزیرے شامل تھے۔ سولہویں اور سترھویں صدی میں یہ اسلامی تہذیب بڑی تیزی سے بڑھی اور پھلی پھولی جس نے دنیا کی بیشتر حصوں کی تہذیبوں کو متاثر کرتے ہوئے ان پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔ یہی اسلامی تہذیب جب ہندوستان میں آئی تو اس نے نہ صرف ہندی تہذیب، چین اور اس کے تہذیبی اثرات کے حامل اکثر علاقوں پر اثر کرنا شروع کیا بلکہ سارے ایشیاء پر اپنا گہرا رنگ جما لیا لیکن یہیں پر اس تہذیب کو تصادم کا سامنا بھی کرنا پڑا بلاشبہ یہ تہذیب ایشیاء کے ساتھ ساتھ افریقہ اور یورپ کو بھی متاثر کرتی رہی ہے لیکن ایشیاء پر اس کے اثرات نمایاں نظر آئے اس لیے رفتہ رفتہ اسلامی تہذیب کو مشرقی کے نام سے بھی جانا جانے لگا لیکن بات اتنی عام نہیں قدرے وضاحت طلب ہے اسلامی تہذیب کے ہوتے ہوئے بھی دوسری تہذیبیں موجود تھیں یوں کہا جا سکتا ہے مشرق کے اندر موجود وہ تہذیبیں جن کے مجموعے سے مشرقی تہذیب بنی ان میں بہت سی قدریں خصوصاً، سیاسی، مذہبی و معاشرتی سطح پر بڑی حد تک مماثلت رکھتی ہیں۔

یہ مشرقی تہذیب اپنی مخصوص روایات، اقدار، اخلاقیات اور عقائد رکھتی تھی دوسری جانب اس کے متضاد کے طور پر مغربی تہذیب نے اپنے اثرات جمانے شروع کر دیے متضاد اس لیے کہ وہ مختلف حصوں سے مشرقی تہذیب سے تقریباً متصادم روایات، اقدار و اخلاقیات رکھتی ہے مذہب ان دونوں تہذیبوں کا بنیادی اختلاف تھا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ عظیم مذہب وہ ہوتا ہے جس پر بڑی بڑی تہذیبیں استوار ہوتی ہیں۔

اس جملے کو الٹا کر کے بھی دیکھنا چاہیے عظیم تہذیبیں وہ ہوتی ہیں جن پر عظیم مذہب استوار ہوتا ہے مشرقی تہذیب کی بنیاد اور اختصاص مذہب ہے جبکہ دوسری جانب مغربی تہذیب کی بنیاد زیادہ تر مادیت پسندی پر رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جغرافیہ، اخلاقیات، روایات، ضروریات، نفسیاتی و جذباتی ہر حوالے سے دونوں تہذیبیں مختلف مقام رکھتی تھیں پھر مشرق و مغرب میں کلچر روایات اور اقدار کے طویل اور بڑی حد تک پار نہ کئے جا سکنے والے فاصلے ہیں۔

مشرق کے لوگوں کی رنگت اور مغربی لوگوں کی جلد دوسرا بڑا فاصلہ ہے ،اگر انسانی اور بنیادی حقوق کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ فاصلہ یا فرق کوئی بڑی بات نہیں لیکن اس فرق نے مشرق و مغرب کو ایک بہت واضح فاصلے پر کھڑا کر دیا ہے۔اس فرق کی بنیاد پر لوگوں کی نفسیات اور اخلاقیات اور روایات و اقدار بالکل مختلف ہو جاتی ہیں۔

یہاں جب ہم تقابل کر رہے ہیں بنیادی اختلافات کو واضح کر رہے ہیں تو مغربی تہذیب سے مراد امریکہ ہی نہیں بلکہ تمام یورپ بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔مشرقی قومیں آغاز میں زیادہ تر دریائوں کے کناروں پر بستی تھیں گویا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مشرقی تہذیب نے دریاؤں کے کناروں پر فروغ پایا لیکن اہل مغرب کی بود و باش زیادہ تر سمندری ساحلوں کے ارد گرد نظر آتی ہے۔

مشرقی تہذیب نے مذہب کے زیر سایہ زیادہ تر اخلاق اور روحانیت کے سائے میں ترقی کی ہے جبکہ مغربی تہذیب نے مادہ پرستی اور ظاہر پرستی کے رجحان کو اپنا کر ترقی کی منازل طے کی ہیں یہ فرق ایسا تھا جس نے دونوں معاشروں کی روایات و اقدار کو متاثر کرتے ہوئے تہذیب کی بنیادوں کو بالکل مختلف کر دیا تھا۔روحانی ،اخلاقی ،جذباتی ،معاشرتی و معاشی روایات اور اقدار نے مشرقی و مغربی تہذیبوں اور ان کے تشخص میں بہت واضح فرق پیدا کر دیا اور یہی فرق تہذیبی شناخت میں فرق کا باعث بنا۔

روحانیت ،مذہب اور اخلاقیات جیسے عناصر مشرقی تہذیب کی بنیاد میں شامل ہیں ان عناصر کو مشرقی تہذیب کا منبع کہا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام کی آمد کے بعد جس تہذیب نے سب سے زیادہ قوموں اور افراد کو متاثر کیا اور اپنے نقوش چھوڑے وہ اسلامی تہذیب تھی اس تہذیب نے نا صرف یہ کہ دنیا بھر کی تہذیبی شناخت پر اپنے مرتب کئے بلکہ اپنی روایات و اقدار کو دوسری تہذیبوں میں متعارف کروا کر ان کا حصہ بنا دیا یہ اسلامی مشرقی اقدار و روایات ،اپنے نظریات و خصوصیات کے باعث آج بھی ایک انفرادی حیثیت و مقام رکھتی ہیں اور انسان دوستی ،اخلاقیات ،ایثار ،قربانی ،قناعت پسندی مساوات حقوق و فرائض کی برابری کا پرچار کرتی ہیں۔

کسی تہذیب کا سب سے اہم عنصر اس کے مذہبی اقدار و روایات اور عقائد ہوتے ہیں اور ہر قدر یا روایت کی تہہ میں کوئی مذہبی روایت ضرور ہوتی ہے اس طرح کوئی تہذیب یک رخی نہیں ہوتی۔مذہبی ،سیاسی اخلاقی روایاتی ،معاشی ،معاشرتی اور جغرافیائی اقدار و روایات مل کر ایک تہذیبی تشخص یا تہذیبی شناخت کی تشکیل کرتے ہیں اس کے ساتھ رسم و رواج ،تصورات ،دیومالا ،فنون لطیفہ اور فلسفہ بھی کسی تہذیب کے لیے اہم کردار کے حامل ہوتے ہیں۔مشرقی تہذیب بھی ان تمام عوامل سے بھرپور ایک مکمل تہذیب ہے اس لیے اس کو سب سے Charming و بھرپور تہذیب کہا جاتا ہے اور دنیا بھر میں سب تہذیبوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ہر تہذیب کی اپنی ایک تہذیبی شخصیت

ہوتی ہے جو اس تہذیب کی انفرادیت ہوتی ہے اور اس کی شناخت بناتی ہے اور اس انفرادی شناخت کی بنیاد پر روایات و اقدار پر ہوتی ہے اور کوئی بھی تہذیب، روایات و اقدار ہی کی طرز پر اور اسی جیسی شکل و صورت رکھتے ہیں اس لیے روایات و اقدار اختلاف تہذیبی اور تہذیبی شناخت کو طے کرنے میں اہم کردار کے حامل ہوتے ہیں۔

مشرقی اقدار و روایات اور مغربی اقدار و روایات کا اختلاف ہر دور میں بہت واضح تھا اس کا تہذیب اور اس کی شناخت پر اثر انداز ہونا ایک لازمی امر تھا جب ہم کسی تہذیب اور اس کی شناخت پر بات کرتے ہیں تو اقدار و روایات وہ بنیادیں ہیں جن کا ذکر لازم ہوتا ہے کیونکہ کسی معاشرے کی تہذیب اور تہذیبی شناخت کو یہی اقدار و روایات طے کرتی ہے مشرقی معاشرے کی تہذیب اور تہذیبی شناخت کو دیکھیں تو وہ بھی اپنی اقدار و روایات کی بنیاد پر رکھی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ستر پوشی، حیاء، روحانیت، اخلاقیات وغیرہ مشرقی معاشرے کی بنیادی اقدار کی حیثیت رکھتی ہیں اس طرح ہماری روایت بھی زیادہ تر روحانیت و مذہب پر مبنی ہے اور یہی ہماری تہذیبی شناخت ہیں۔ مشرقی تہذیب اپنی روایات و اقدار کی بہت گہری جڑیں رکھتی ہے یہ صرف تاریخ یا حالات و واقعات کی بنیاد پر پروان نہیں چڑھتی تہذیب کی رگوں میں بہت سی روایات ایسی ہیں جو ہمارے معاشرے کی بنیاد ہیں ان میں سے سب سے اہم مذہب ہے جو انسانی اخلاقات و روایات کا احترام کرنے کا سبق دیتا ہے مشرقی معاشرہ انسان اور گروہ پر بہت سی مذہبی، اخلاقی پابندیاں عائد کرتا ہے اور دوسری جانب حقوق کی صورت میں ان کو ایک وقار، عزت، مقام و مرتبے کا حق دار ٹھہرایا جاتا ہے ان اقدار کی بنیاد پر تشکیل پانے والی تہذیب کی انفرادیت مشرقی تہذیب کی شناخت ہے۔

ناول ساسا میں ناول نگار پورے طریقے سے پاکستان و امریکہ کے تہذیبی پس منظر سے آگاہ ہیں اور وہ پاکستان کی اس وقت کی مجموعی تہذیبی صورت حال کو امریکہ کی معاصر تہذیبی صورت حال کے سامنے رکھتے ہیں انسان اور انسان کی قدر مشرقی تہذیب کی بنیاد میں شامل ہے اور اسلامی تہذیب کی سب سے بڑی خوبی ہے لیکن اب تہذیبی صورت حال اس قدر تبدیل ہو چکی ہے جہاں امریکہ میں ایک پرندے کے بیمار ہونے پر فوراً ایمبولینس آجاتی ہے دوسری جانب روزانہ کی بنیاد پر سینکڑوں لوگ مرتے ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا ہے۔ یہ صورت حال ناول نگار نے ہمیں ایک تہذیبی المیے کی ہیت میں دکھائی ہے۔

مشرقی تہذیب میں عقیدہ اور آئیڈیالوجی مل کر انسان کو ماورے سے برتر ایک الگ مقام اور حیثیت سے روشناس کرتی ہے اور اس قدر کے زیر سایہ انسانی عظمت نظر آتی ہے مغربی تہذیب سے مراد وہ تہذیب ہے جو گزشتہ ۳۰۰ سالوں کے دوران یورپ میں ابھری اس کا آغاز تقریباً ۱۶ ویں صدی میں مشرقی یورپ پر ترکوں کے قبضے کے بعد ہوتا ہے جب یونانی اور لاطینی علوم کے ماہر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف علاقوں خصوصاً مغربی یورپ کی طرف

بھاگے جو اس وقت تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ مشرقی علوم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے وہاں ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی، سائنس فلسفہ اور مشینوں کی ترقی نے اس تہذیب کو بہت طاقتور بنایا کہ آج یہ تہذیب اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ جس طرح مشرقی تہذیب کی شناخت اس کی روحانیت اخلاقیات اور مذہب پر ہے۔ اسی طرح مغربی تہذیب کی بنیاد اقلیت مادیت اور سائنسی ترقی پر ہے اور یہ مغربی تہذیب کی شناخت کا سب سے اہم حصہ ہے ۔ مغرب کے ہاں مادی ترکی کو ہی معراج کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ہر تہذیب میں ایک لازمی عنصر ہوتا ہے جسے مذہب کہا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کون سی تہذیب کس مذہب کو کس درجے تک اہمیت دیتی ہے۔ مشرقی تہذیب کی بنیاد ہی مذہب پر ہے اور مذہب ہی ہماری تہذیب کی بنیادی شناخت ہے۔ 'مغرب ایسی واحد تہذیب ہے جس کو کسی خاص مذہب جغرافیائی علاقے یا لوگوں کے نام کی بجائے کتب نما کی سمت کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ یہ پہچان اس تہذیب کو تاریخی جغرافیائی اور ثقافتی زاویوں سے ماورا کر دیتی ہے۔

تاریخی اعتبار سے مغربی تہذیب یورپی تہذیب ہے جدید عہد میں مغربی تہذیب یورپی، امریکی یا شمالی اٹلانٹک تہذیب ہے۔ یورپ، امریکہ اور شمالی اٹلانٹک کو تو نقشے پر دیکھا جا سکتا ہے لیکن مغرب کو نہیں۔ اس مغرب نے مغربیت کے تصور کو پیدا کیا ہے۔

> مغربی تہذیبی شناخت کی بنیادیں بہت گہری نہیں ہو سکی سطحی نظریات اور اقدار و روایات نے اس تہذیبی شناخت کو بے حد متاثر کیا جب کے دوسری جانب مشرقی تہذیبی شناخت بہر حال اس کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اور پائدار ہے اور عوام کے لیے اثر انگیز بھی۔ اقلیت پسندی کے باعث مغرب انسانی افکار کو عقل کے علاوہ کسی کسوٹی پر رکھنے کے لیے جغرافیائی اور سماجی روایات میں سے اخلاقیات روحانیت اور مذہب کو بالکل ہی خارج کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی عقل کو بالکل بے لگام کر دیا گیا۔ مغرب کی تہذیب میں زندگی کو صرف عقل اور مادے تک محدود کر دیا گیا ہے جس کے باعث انسانیت کے مفاد اور خوشی یا روحانی اور جذباتی آسودگی کو پس پشت ڈال دیا گیا۔[۲]

فرد کو صرف مادی خواہشات اور اسودگی کا نظریہ دے کر روحانیت اور مذہب کو ثانوی درجے پر رکھ دیا ہے۔ انسانی حقوق اور معاشرتی آزادی نے اس تحریک کو فروغ دینے میں اپنا حصہ ڈالا جس کے باعث آج کا مغربی معاشرہ فرد کو اداروں یا معاشرتی بندھنوں میں جکڑ کر نہیں رکھتا اس تمام بحث سے یہ مراد ہر گز نہیں ہے کہ مغربی تہذیب میں صرف خامیاں ہی خامیاں ہیں۔ مغربی تہذیبی اقتدار و روایات میں آزادی ایک ایسا عنصر ہے جس نے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کیا۔ مغربی تہذیب فرد پر پابندیاں نہیں لگاتی بلکہ اسے معاشی، معاشرتی،

اخلاقی، جذباتی اور روحانی ہر طرح کی آزادی دینے کی قائل ہے۔اس خوبی نے دیگر معاشروں اور خصوصانوجوان نسل کواپنی جانب راغب کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

مشرقی اور مغربی اقدار و روایات میں بے پناہ فرق بلکہ بڑی حد تک تو تضاد پایا جاتا ہے۔اور یہ تضاد صرف جغرافیائی نہیں ہے۔بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی پے اس کی جھلک پائی جاتی ہے۔اسی تضاد نے دو مختلف تہذیبوں کو جنم دیا جن کی شناخت بالکل مختلف ہے اور ایک دوسرے بہت گہرے اور نہ مٹنے والے اثرات مرتب کئے ہیں۔اکثر مقامات پر اسی تضاد نے دونوں تہذیبوں کو ایک دوسرے کے مد مقابل لا کھڑا کیا ہے اور آج دونوں تہذیبیں اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے تشخص اور بقا کی جنگ لڑ رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں مشرق کو مغرب سے خطرہ، مغرب کو مشرق سے خطرہ جیسے عناصر دیکھنے سننے کو ملتے ہیں۔

عمومی طور پر سیاست کے علم کو سیاسیات کہا جاتا ہے جو موجودہ عہد کے انسان کا نعرہ بھی ہے اور ترجیح بھی ہے، سیاسیات سے ہمارا مطلب کاروبار حکومت ہے یعنی ان لوگوں کو قابو میں رکھنا یا ان لوگوں کی منظم انتظامی سرگرمیاں فراہم کرنا جو معاشرہ رکھتے ہوں۔ایک محض اتفاقی مجموعی معاشرہ نہیں ہے اس کا کوئی معین مقصد نہیں ہے وہ تو کسی فوری خیال سے جمع ہوتا ہے اور کچھ وقت بعد وہ اکھٹا منتشر ہو جاتا ہے اس گروہ کے ارکان اس مجموعے کے متعلق کسی بھی طرح کے فرائض کی ذمہ داری نہیں لیتے ہیں نا ہی یہ مجمع کوئی تاریخ رکھتا ہے اور نہ ہی کوئی تاریخ رقم کرتا ہے۔

سیاست کا لفظ اب معاشرے میں اس قدر اہم ہو گیا ہے کہ اس کے اصل معنی دوسری اصطلاحی و مردی معنوں میں دب کر رہ گئے ہیں سو ہم کہ سکتے ہیں کہ سیاست کا لفظ ابہام کا شکار ہو گیا ہے چال بازی کو سیاست، دھوکہ دہی کو سیاست، چالاکی کو سیاست، سچ کی آڑ میں بولے جانے والے جھوٹ کو سیاست کا نام دیا گیا ہے۔سیاست کا دوسرے علوم کے ساتھ گہرا تعلق ہے یہ دوسری علوم سے استفادہ بھی کرتی ہے اور ان سے کسی سطح پر ٹکراتے ہوئے بھی معلوم پڑتی ہے۔اگر سیاست کے مجموعی معنی تلاش کئے جائے تو ہمارے پاس ایک معمولی مگر خاص اصطلاح آتی ہے جس کو حکومت یا نظام حکومت کہا جاتا ہے گویا سیاست سے مراد حکومت کے اسرار ورموز ہے یہ پھر سیاست سے مرد حکومت کا باقاعدہ طریقہ کر کے ہیں۔حکومت کا لفظ جب اپنے وسیع ترین معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اصولا وہ (تعرف واطاعت) دونوں خیالوں پر مبنی ہوتا ہے اقتدار اور اس اقتدار کی فرماں پذیری دونوں اس لفظ کے مفہوم میں شامل ہے پس اس طرح ایک بہت خاص کا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے جس کی وجہ سے ہمیں یہ سمجھنے میں آسانی رہتی ہے کہ تمدن انسانی نے جب سے اپنی موجودہ صورت اختیار کی ہے اسی وقت سے یہ بھی اس کے دوش بدوش چلی آرہی ہے اور ازمنہ گزشتہ میں اس کا سراغ قریب قریب اس زمانے تک ملتا ہے جہاں تک کہ خود معاشرت انسانی کی تاریخ کا

پتہ چلتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم جس قدر تاریخ کے بعید زمانوں کی طرف پیچھے ہٹتے جاتے ہیں اسی قدر یہ دھندلی ہوتے ہوتے آخر میں بالکل نظروں سے غائب ہو جاتی ہے لیکن یہ مسئلہ تمام ارتقائے معاشرت کی اقسام کے ساتھ پیش آتا ہے جب ہم آغاز کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں سیاست کا تعلق براہ راستہ حکومت کے ساتھ جڑا ہوتا ہے یہی سیاست کی معراج ہے اور سیاست کا مقصد کچھ ارباب دانش نے حکومت کو ہی قرار دیا ہے لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اس سے حاصل ہونے والی حکومت کس طریقے سے آتی ہے ماضی میں ہم دیکھتے رہے ہیں۔بیرونی حملہ آوروں نے آکر اپنی حکومتیں قائم کیں تو ایسی حالت میں سیاست کا تصور ذرا سا غائب ہو جاتا ہے۔ہم حکومت کی گزشتہ و موجودہ بہت پر نظر ڈالیں تو ان میں کسی قسم کی یکسانیت نہیں دیکھتے ہیں۔ارتقاء وہ اہم کڑی ہے جو اشیاء و تصورات کی زندہ رہنے کی ضامن ہوتی ہے اگر ایک شے یا تصور اپنے حالت تبدیل نہیں کرے گا تو زمانے کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائے گا۔یہی معاملہ حکومت کی ذیل میں ہمیں نظر آتا ہے اس کی شکلیں تبدیل ہوتی رہی ہیں اور یہ ارتقاء کا سفر جاری رکھتے ہوئے اپنے اندر مزید تبدیلیاں لائی جائے گی اس کے حدود، عمل اور اس کے مقصد میں فرق ہوتا رہتا ہے۔

جب ہم ابتدائی زمانے کے خانہ بدوش اقوام کے کمزور روابط یونانیوں کی شہری سلطنت ،قرون وسطیٰ کے جاگیری نظام اور زمانہ حال کی قومی سلطنت کی چلتی ہوئی کل کے پیچ در پیچ طریق عمل کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں تو حکومت کے حقیقی اختلافات فوراً ہی عیاں ہو جاتے ہیں۔نظم و نسق انسانی کی اپنی مختلف اقسام سے (جن میں حکومت کا عنصر مشترق ہے)جو مختلف لپٹیں پیدا ہوتی ہیں انہی سے علم سیاست ظہور پذیر ہوتا ہے۔مختلف علوم کے پیدا ہونے کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ضرور موجود ہوتا ہے جس طرح پودوں کی طرف جائیں تو جستجو نے پورا شعبہ علم نباتات قائم کر رکھا ہو اس طرح کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔اس طرح تنظیمات انسانی کے عالم میں ہئیات زیر بحث کی مختلف الجھنیں و پیچیدہ صورت ہی سے علم السیاست کی بنیاد قائم کرنے کا موقعہ یاد آتا ہے۔اس علم کا کام یہ ہے کہ انسانی نظم و نسق کی ان مختلف ہئیتوں کا امتحان اور تجزیہ کیا جائے جن میں معاشرتی اقتدار کا عنصر جزو اعظم کی طرح داخل ہے۔

اس موقع پر ہمارے طبعی و معاشرتی ماحول کے مطالعے میں ایک مزید مماثلت پیدا ہوتی ہے ان دونوں میں جس آثار کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

> وہ دائماً تغیر و تحرک کی حالت میں رہتے ہیں قدیم صورتوں کی بجائے نئی صورتیں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں اور کل مجموعے سے ترقی پذیر ہوتی رہتی ہیں اور کل مجموعے سے ترقی پذیر ترکیب کا ایک تدریجی سلسلہ ظاہر ہوتا ہے جس میں قوائے عملی کی روزافروں پیچیدگی کی حسب حال صورت وہئیت میں پایہ

بہ پایہ ترقی کرتی جاتی ہے۔ عالم طبعی میں قوت حیات سادی وابتدائی حالت سے گزر کر پیچیدہ ہوتی جاتی ہے۔[۳]

ہم نے پہلے بات کی کہ سیاست اپنی شکلیں تبدیل کرتی رہی ہے اور اس میں کچھ تبدیلیاں ایسی آئی جو ہم عصر صورت حال کے ساتھ ہم آہنگ ہونے میں مدد دینے لگی۔ سیاست کا باضابطہ تعلق حکومت کے ساتھ جا کر ملتا ہے یوں سیاست حکومت سے پہلے بھی موجود ہوتی ہے اور بعد میں بھی اس میں جو تبدیلی آتی ہے وہ فقط یہی ہوتی ہے کہ حکومت سے پہلے کی جانے والی سیاست کا بڑا مقصد اقتدار کا حصول ایک باضابطہ طریقے کے تحت ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ سیاست ایک علم کی صورت میں بھی موجود رہتی ہے اس بنیاد پر سیاست یا سیاسی دانش ور ملک کے بدلتے ہوئے حالات، حکومت کا نظام اور سیاست میں آنے والی تبدیلیوں کو نشان زد کر کے ان پر بات کر رہا ہوتا ہے۔ سیاست کے طور طریقے چال ڈھال وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں ابتدا میں دیکھیں تو آریا کی آمد کے ساتھ ہی ایک انتظامی صورت کی ضرورت پیش آچکی تھی۔ چاہے وہ ضرورت دڑاوڑیوں کا حق مرنے کی شکل میں ہو اس کے بعد زمانہ اپنی چال چلتا رہا اور مشرق و مغرب میں حکومتی سطح پر بھی بے شمار تبدیلیاں آتی رہی۔ سیاست کا انداز اور طور طریقے بدلتے چلے گئے۔ خصوصاً اگر ہم بر صغیر کی بات کریں تو یہاں پر بھی مغل، خلجی، غوری اور دوسرے حکمران حملہ آور ہوتے رہے۔ حکومت حاصل کرتے رہے۔ ایک پرانی زمین کو اپنی ازمین سمجھ کر سیاسی پہلوؤں پر عمل کرتے رہے۔ اور بے شمار تبدیلیاں آتی رہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام آیا اشتر کی نظام آیا نو بادیات کا دور آیا ان سب کے ہاں سیاست اور حکومت موجود تھی۔ لیکن ان میں سیاست کرنے اور سیاسی نظام لاگو کرنے کے طور طریقے ایک دوسرے سے مختلف تھے اب موجودہ عہد کی اگر بات کر لی جائے تو کہیں پر جمہوریت ہے اور کہیں پر کوئی دوسرا سیاسی نظام لاگو ہے لیکن اکثریت ہمارے پاس جمہوری نظام کی ہے۔

سیاست ایک واضح اور باقاعدہ تعلق دوسرے علوم کے ساتھ رکھتی ہے۔ علمائے سیاست کا خیال ہے کہ وہ تاریخ کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ مختلف زمانوں میں آنے والی سیاسی تبدیلیوں اور عوامی رجحانات کی جانچ پرتال کر سکیں اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیاست کا تاریخ کا سیاست و تعلق اور واسطہ رہتا ہے۔ کچھ علماء کا خیال ہے کہ سیاست تاریخ کی ایک شاخ ہے بلکہ اس معاملے کو یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ دونوں علوم بیک وقت ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ تاریخ کے بغیر سیاست کا وجود ناممکن ہے اور اسی طرح حکومتی ادوار کو سیاست بحث کرتی ہے جو تاریخ کے حوالے سے بہت ضروری ہے۔ علم کی ان دونوں شاخوں کے گہرے تعلقات پر بات کرتے وقت ان حقیقی اختلافات کو بھی ہرگز نہیں بھولنا چاہیے۔ تاریخ کی خالص میاکاتی حیثیت سے سیاست کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ واقعات

اور حالات ایک سیاست کے عالم کے لیے صرف ایسی حد تک ضروری ہے کہ ان سے وہ مقصود وقت کے انتظامی علوم کا جائزہ لے سکے۔

علم میں سیاست کے علم کا اقتصادیات سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اقتصاد معاشرے کی ایک بڑی ضرورت ہے اور کسی بھی معاشرے کا اہم دار و مدار دولت پر ہوتا ہے۔ حصول دولت کے متعلق انسان کی جد وجہد کی تحقیق اس کا موضوع بحث یہ ہوتا ہے کہ مادی اور نفسی حالات کے زیر اثر دولت کی پیداوار اور اس کی تقسیم کیونکر ہوتی ہے اور چونکہ مادی دولت کی پیداوار اور اس کی تقسیم بہت بڑی حد تک موجود الوقت حکومت کی نوعیت اقتصادی زندگی کی تنظیمی بنیاد پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لیے سیاست کو اقتصادیات کے مطالعے سے گہرا تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ علم تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ 'انگلستان کے قدیم علمانے اقتصادیت نے جو طریقہ قائم کیا تھا وہ نتیجہ اس عمل کا تھا کہ وہاں ابتدا سے شخصی ملک کا اصول مسلم تھا نظامے معاشرت کے تحت ہر شخص ہر طرح معاہدے کرنے کے لیے آزاد تھا۔ اور سوسائٹی کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی تھی۔ دوسری جانب یہ کہنا بھی درست ہے کہ سیاسی ادارت پر اقتصادی حالات کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ کسی خاص زمانے اور مقام پر حکومت کی جو صورت ہوتی ہے اور اس کی قوت عمل جس جانب مائل ہوتی اور وہ جس حد تک کم کرتی ہے اس انحصار ایک بڑی حد تک اسی قوم کی اقتصادی زندگی پر ہوتا ہے۔'

> چنانچہ ہر شخص یہ خیال کرے گا کہ ایک خانہ بدوش گلہ بان قوم کے سیاسی ادارت اس گروہ سے بالکل مختلف ہوں گے جو ایک جگہ رہ کر محدود ذرات سے اپنی معاش حاصل کرتا ہو اور پھر ان دونوں کی حالت اس کاروباری آبادی کی حکومت سے بالکل مختلف ہو گی جو بڑے بڑے شہروں میں جہاں صنعت و حرفت کا مرکز ہو جشماعہ ہو کر رہتی ہے لیکن اقتصادیات وسیاست کا تعلق صرف انہیں اصولی بنیادوں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ بے شمار ایسے مباحث ہیں جو بیک وقت دونوں پر بات کرتے ہیں۔۔۔۔[۲]

دستوری قانون کے لیے بہترین صورت یہ ہے کہ اسے سیاسیات کی ایک شاخ قرار دیا جائے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے کہ ایک بڑی حد تک دونوں کا حیطہ عمل ایک ہی ہے کیونکہ دستوری قانون کسی خاص سلطنت کے کسی خاص وقت کی تنظیم کا تجزیہ کر دینے کا نام ہے اس عمر میں رائیں مختلف ہوں گی کیونکہ قومی قانون اور بین الاقوامی قانون میں فرق ہوتا ہے ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے قانون کو سیاست میں شامل کرنا چاہیے یا نہیں؟

عمرانیات اور سیاسیات میں گہرا تعلق ہے اس کو ایک دوسرے کے ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے عمرانیات کی بنیادی بحث معاشرے سے شروع ہوتی ہے اور سیاسیات بھی خاص حوالوں سے معاشرے پر بحث کرتی ہے اس کے انتظامی امور کو دیکھتی ہے معاشرے یا عوامی گروہ کو منظم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ عمرانیات نا صرف ایک انسان کے

دوسرے تمام انسانوں کے ساتھ قانونی و تحدیدی تعلقات پر بحث کرتی ہے بلکہ رسم ورواج، عادات واطوار، مذہبی و انسانی زندگی کے ارتقاء و منزلت کو بھی زیر بحث لاتی ہے۔

سب سے زیادہ اہم و قابل لحاظ عمر یہ ہے کہ عمرانیات نہ صرف انہیں معاشرتی جدوجہد سے بحث کرتی ہے بلکہ وہ غیر ارادی نتائج سے بھی بحث کرتی ہے۔ اس لیے اس علم کو ایک ایسا علم بھی کہا جا سکتا ہے جو مختلف اقسام علوم کا مجموعہ ہو یوں تو اس کو علم معاشرت کہا جائے گا ایسی صورت میں ہمارے پاس علم سیاسیات کی قدرے واضح صورت آجائے گی یعنی کہ سیاست وہ علم ہے جو علم معاشرت کی ایک شاخ ہے اور سلطنت کی اساس اور حکومت کے اصول سے بحث کرتی ہے بلچلی علم سیاسیات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> سیاست علم معاشرت کی وہ شاخ ہے جس کا تعلق سلطنت سے ہے اور جس کی سعی یہ ہے کہ سلطنت کے حالات اس کی حقیقی نوعیت اس کے مختلف اشکال و آثار اور اس کی نشو نما کو کما حقہ سمجھ کر ان کی تشریح و توضیح کی جائے۔[۵]

ناول کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ ناول بھرپور زندگی کا عکاس ہوتا ہے اس طرح سے اس بنیادی زاویے پر ناول ساسا بھرپور طریقے سے کارآمد نظر آتا ہے سیاسی منظر ناموں کو عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے اور سیاسی اہمیت سیاست کن حالتوں میں ہماری خارجہ پالیسی کے امور پر اثر انداز ہوتی ہے ان تمام اشیاء کو شاندار پیرائے میں لیکن علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے جس طرح ۱۱ / ۹ کے واقعے کے بعد ایک پورا تصور ہی بدل کر رہ گیا خصوصاً ان لوگوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جو امریکہ میں مقیم تھے اور ان پر دہشت گردی کا لیبل لگا دیا گیا اس پر ہم آگے چل کر بات کریں گے اہم معاملہ یوں ہے کہ امریکہ ایک جمہوری ملک ہے موجودہ سیاسی نظام پاکستان کا وہ بھی جمہوریت ہے اس کے سیاسی افق پر بہت سی تبدیلیاں آتی رہی ہیں کبھی مارشل لاء کا طویل دور کبھی نیم مارشل لاء کبھی جمہوریت اور کبھی کٹھ پتلی جمہوریت اس طرح آج تک یہ نظام چلتا آرہا ہے۔

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات عجب ڈھنگ پر استوار ہیں یہ تعلق مفاد کا تعلق ہے جس طرح پاکستان کو مدد کرنا پڑی اور دوسری جانب امریکہ ایک بھاری امدادی رقم فراہم کرتا ہے امریکہ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی جیسے مراحل پر پاکستان کو ناراضی کا بھی سامنا کرنا پڑا یوں آپسی حالات بنتے بگڑتے رہے ہیں۔ ۹/۱۱ خود تھا کیا اس میں واضح حقائق سامنے نہیں آئے بس اس کے متعلق باتیں کی جاتی رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ۹/۱۱ کمیشن رپورٹ سے بھی واضح افاقہ نہیں ہوتا ہے۔

۹/۱۱ کے بعد پوری قوت سے امریکہ حملے کے لیے پلٹتا ہے جس طرح کسی نے شیر کی دم پر پاؤں رکھ دیا

ہو اور اس سرگرمی کا وطن عزیز کو جہاں نقصان ہوا سو ہوا افغانستان ایک بار پھر پتھر کے زمانے میں چلا گیا جس کی وجہ سے آج بھی وہاں بے کسی کے بادل چھائے ہوئے ہیں پاکستان کے علاقوں میں آپریشن کئے گئے۔

آج بھی کسی پاکستانی کو پردیس جانا پڑے تو اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ۹/۱۱ کے حملے میں کوئی بھی پاکستانی شامل نہیں تھا تو پھر پاکستان کو اس قدر نقصان کیوں اٹھانا پڑا ہے کچھ لوگوں کے خیال میں یہ بھی ایک سیاسی چال تھی۔

پاکستانی اور امریکہ کے تعلقات کو واضح کرنے میں ہو مپیو کے دورے کو دیکھا جا سکتا ہے اس سے بڑی حد تک امریکی سیاسی پالیسیوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہو مپیو صاحب کے جانے کے بعد تو وطن عزیز کی حکومت کی جانب سے یہ تاثر دیا جانے لگا کہ امریکہ فتح کر لیا ہو جیسے P کا یہ دورہ پانچ گھنٹوں پر مشتمل تھا جس کے بعد ایک گھنٹہ صحافیوں کو بریفنگ دی گئی اصل بات وہی پرانی روایت پر مبنی تھی کہ اس بار P صاحب خاص مطالبات بلکہ مطالبات تو دیتے نہیں امریکہ کی طرف سے دھمکیاں دی جاتی رہی ہیں خاص دھمکی لے کر آئے تھے لیکن دھمکی زیادہ سخت اس لیے نہ ہو سکی کیونکہ ان کے آنے سے پہلے ہی ہم ان کا مطالبہ مان چکے تھے یہ خوشی کا اظہار صرف اسی وجہ سے تھا کہ P نے زیادہ سخت رویہ یا انداز میں اپنایا اور مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان افغان طالبان کو مذاکرات کی منبر پر لانے میں مدد کرے۔ اس صورت میں ایک حربہ یہ اپنایا گیا کہ P کی پاکستان آمد سے پہلے امریکہ نے پاکستان کی واجب الادا کولیشن سپورٹ فنڈ کی مد میں تیس کروڑ ڈالر کی ادائیگی روک دی تھی اور پاکستانی حکومت اس قدر دفاعی پوزیشن میں رہی کہ P کے دورہ پاکستان کے موقع پر ان سے اس کی بحالی کا اعلان تک نہ کروا سکی۔

امریکہ کو پاکستان سے شکایت ہے کہ وہ افغانستان کے معاملے میں حسب منشا تعاون نہیں کر رہا ہے جبکہ پاکستان کو امریکہ سے شکوہ ہے کہ وہ اس کی قربانیوں کو تسلیم نہیں کر رہا ہے امریکہ کو شکایت ہے کہ پاکستان، افغانستان اور خود اپنی سرحدوں کے اندر انتہاء پسندوں اور دہشت گردوں کے خلاف سنجیدہ کاروائی کا تعین نہیں رکھ رہا ہے جبکہ پاکستان کو شکایت ہے کہ امریکہ افغانستان اور خطے میں پاکستان کے مفادات کو مد نظر نہیں رکھ رہا۔ سب سے اہم شکایت جو امریکہ کو پاکستان سے ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان خطے میں چین کا اسٹریٹیجک پارٹنر اور اتحادی کیوں بن رہا ہے جبکہ پاکستان کو اصل شکایت یہ ہے کہ امریکہ بے وفائی کر کے ہندوستان کو گلے کیوں لگا رہا ہے۔ سلیم صافی نے اپنی کتاب (متبادل بیانیہ) میں "امریکہ سے کہہ دیں" کے عنوان سے چند باتیں لکھی ہیں جس سے صورت حال مزید واضح ہو جاتی ہے۔

ہمارے تعلقات امریکہ سے آج قائم نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان کو ایک عرصہ ہو چکا ہے اب پاکستان کچھ

حد تک استحکام بھی حاصل کر چکا ہے اب پاکستان کو اک بار دوٹوک بیانیے کے ساتھ امریکہ کے ساتھ لازمی بات کر لینی چاہیے۔[6]

پاکستان کو کہہ دینا چاہیے کہ اگر ہم وفادار نہیں ہیں تو امریکہ کے ہاں بھی وفاداری نہیں ہے سوویت یونین کے ساتھ جنگ دونوں نے مل کر لڑی آپ نے صرف ڈالر دیئے لیکن ہم نے پورا ملک اس آگ میں جھونک دیا تا ہم سوویت یونین کے نکلتے ہی آپ نے افغانستان کو بھلا دیا اور ساری مصیبت ہمارے گلے ڈال دی جنگ کے بعد افغانستان کو سنبھالنے میں تم نے ہماری کوئی مدد نہیں کی بلکہ الٹا ہمارے اوپر ہی پابندیاں عائد کرنا شروع کر دیں۔

امریکہ سے کہہ دیں کہ ہم نے یہ غلطی کی پہلے حکمت یار کو مسلط کرنے میں برہان الدین ربانی، احمد شاہ مسعود اور دیگر مجاہدین لیڈروں کو ناراض کیا اور پھر طالبان کی طرف داری کرنے حکمت یار کو دشمن بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ پھر ۹/۱۱ تک طالبان کو ایسے عالم میں مدد فراہم کرتے رہے کہ جب دو ممالک کے سوا پوری دنیا ان کی مخالف تھی لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ طالبان بنیادی طور پر امریکی CIA کی تخلیق تھے اور مرل نصیر اللہ بابر نے جس طرح طالبان کو اپنے بچے قرار دیا تو کسی پاکستان کے کہنے پر نہیں بلکہ CIA کے کہنے پر۔

امریکہ سے کہہ دیں کہ طالبان اچھے تھے یا برے لیکن پاکستان کے مخالف نہیں تھے وہ ہندوستان و ایران اس وقت کی پراکسی وار یعنی شمال اتحاد کے مقابلے میں پاکستان کے تمام اسٹریٹیجک مقصد پورے کر رہے تھے۔ القاعدہ نے بھی تب تک پاکستان کے خلاف جنگ کا اعلان نہیں کیا تھا۔ ہم نے آپ کی خاطر طالبان کی حکومت ختم کی اس سلسلے میں پاکستان نے اس حد تک تعاون کیا کہ دو سابق سفیروں (جن میں ملا عبدالسلام ضعیف اور غیرت بھیر) کو اسلام آباد سے گرفتار کر کے آپ کے حوالے کیا آپ نے ان کو رہا کر دیا بعد میں انہوں نے پاکستان کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ ہم نے انھی سڑکیں پیش کی اپنے ہوائی اڈے دیئے پورے پاکستان کو CIA اور BlackWater کی چراگاہ بنا دیا ہم نے القاعدہ کو اپنا دشمن بنایا جبکہ آپ کے ہاں ۹/۱۱ کے بعد کوئی واقعہ پیش نہیں ہوا ہمارے ہاں ہر روز واقعات ہونے لگے اور جب طالبان پاکستان کے خلاف کاروائیاں کرنے لگے تو آپ نے ان افغانستان میں ان کو ٹھکانے عطا کئے۔

امریکہ سے کہہ دیں کہ ہم یہیں بلکہ احمد شاہ مسعود بھی ۹/۱۱ تک آپ کو دہائی دیتے رہے کہ افغانستان کی فکر کر لیں لیکن جب تک ۹/۱۱ کی شکل میں آگ آپ کے گھر تک پہنچی تو آپ تب جا کر اس کی جانب متوجہ ہوئے اور تو اور آپ نے افغان مہاجرین کو بھی ہر طرح کی مدد بند کی اور پاکستان ۹ USAID کے دفاتر کو بھی تالے لگا دیئے۔

امریکہ سے کہہ دن کہ طالبان لیڈر تب بھی پاکستان میں چھپے ہوئے تھے لیکن ۲۰۰۳ء تک افغانستان استحکام کی طرف جا رہا تھا۔ طالبان کی حکومت ہمارے تعاون کی وجہ سے آپ کی توقعات سے بھی پہلے ختم ہو گئی۔ آپ لوگوں سے حامد کرزئی کی ابتدائی ملاقاتیں بھی ہم نے پاکستان میں کروائیں ابتدائی دو سالوں میں افغانستان کے اندر خود کش

حملے تھے اور نہ جنگ ہو رہی تھی۔ پاکستان اسی طرح پڑوس میں تھا لیکن تب افغانستان استحکام کی طرف جارہا تھا انتخابات ہوئے، آئین بنا، بھر سے افغان سرمائے سمیت واپس لوٹ رہے تھے لیکن آپ کے ذہن پر عراق کو فتح کرنے کا بھوت سوار ہونے لگا اور افغانستان کو پوری طرح سنبھالے بغیر آپ عراق میں جا گھسے۔ زیادہ فوجی قوت افغانستان سے وہاں منتقل کر دی اس جنگ نے امریکہ کی اخلاقی حیثیت کمزور کر دی ابو غریب جیل کی تصاویر نے طالبان اور القاعدہ کے پیغام میں نئی جان ڈال دی۔ ایران کو خدشہ ہوا کہ وہ ایک سینڈوچ بنتا جارہا ہے سو اس نے بھی طالبان اور القاعدہ کی مدد کرنا شروع کر دی۔ افغانستان کی جنگ کو سب سے زیادہ نقصان عراق جنگ نے پہنچایا اور ظاہر ہے کہ عراق جنگ میں پاکستان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

امریکہ سے کہہ دیں کہ چلیں مان لیتے ہیں کہ طالبان پاکستان میں بیٹھ کر افغانستان میں جنگ لڑ رہے ہیں لیکن اہم سوال یہ ہے کہ کیا افیون کی کاشت بھی پاکستان سے کی جارہی ہے طالبان نے تو اپنے دور میں افیون کی کاشت ختم کی تھی لیکن آپ کے زیر انتظام افغانستان ایک بار پھر افیون پیدا کرنے والا سب سے بڑا ملک بن گیا۔ اسی وجہ سے افغانستان کی سیاسی فضاء میں بھی عجوبے رونما ہونے لگے جیسا کہ کسی ملک کا نائب صدر اپنے ملک میں واپس نہیں آسکتا ہے اور ترکی میں بیٹھا ہوا ہے۔

امریکہ سے کہہ دیں کہ پاکستان میں ۹/۱۱ کے بعد افغانستان کے متعلق ایک ہی پالیسی رہی ہے جبکہ آپ کی پالیسی ہر سال تبدیل ہوتی رہی ہے۔ پاکستان مشورہ دیتا رہا کہ سب القاعدہ اور طالبان کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکنا چاہیے۔ پاکستان ماڈریٹ طالبان سے مفاہمت کی تلقین کرتا رہا خود افغان حکومت نے بھی ان سے مفاہمت کے لیے صبغت اللہ مجددی کی سربراہی میں کمیشن بنادیا لیکن صدر بش کی پالیسی ہر طرح کے طالبان سے لڑنے اور انکو کچلنے کی تھی۔ اب ٹرمپ انتظامیہ نے ایک اور پالیسی دے دی جسے خود سابق افغان صدر حامد کرزئی نے بھی مسترد کر دیا۔ اوباما نے افغانستان سے نکلنے کی تاریخ دے کر طالبان کے مورال کو بلند کیا لیکن بعد میں ڈونلنڈ ٹرمپ کی پالیسی یہ سامنے آئی کہ کسی صورت افغانستان سے نہیں نکلیں گے۔

امریکہ سے کہہ دیں کہ طالبان کے متعلق جتنی کنفیوژن امریکہ اور افغان حکومت کے ہاں ہے اتنی شدید پاکستان کے ہاں نہیں ہے کبھی یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں چھپے طالبانوں کو مار دو کبھی کہتے کہ ان کو نکل دو کبھی کہا جاتا ان کو مذاکرات کے لیے آمادہ کر لو دنیا بھر میں طالبان کا واحد واضح اور اعلانیہ دفتر قطر میں ہے جو امریکہ کے کہنے پر قائم کیا گیا ہے۔ اس طرح دوسرا واضح ٹھکانہ کابل ہے جہاں عبدالسلام ضعیف اور مولوی احمد متوکل جیسے لوگ بیٹھے ہیں اب آپ لوگ ان کو نکالتے ہیں ان سے مذاکرات کر رہے ہیں اور نہ ان کو مار رہے ہیں لیکن دوسری طرف پاکستان سے

مطالبہ ہے کہ وہ پاکستان میں چھپے طالبان کو اپنا دشمن بنادے اب اگر پاکستان افغانستان سے لڑ کر ان کو اپنا دشمن بنادے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کل انہیں بھی گلبدین حکمت یار کی طرح کابل میں شاہی مہمان نہیں بنایا جائے گا؟

امریکہ سے کہہ دیں کہ آپ بار بار پاکستان کو دی جانے والی امداد کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہوئے پاکستان کو رسوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ یہ امداد اس نقصان کا عشر آشیر بھی نہیں جو اس جنگ میں پاکستان نے اٹھایا آپ لوگوں نے افغانستان جنگ پر جتنا خرچ کیا اس کا ۵ فیصد بھی تعمیرات پر خرچ نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ آج بھی کابل شہر کی سڑکیں نہ گفتہ بہ ہیں۔

امریکہ سے کہہ دیں آپ نے بارنٹ روبن جیسے جنوبی ایشیا اور افغانستان کے ماہرین اس نتیجے تک پہنچے تھے کہ افغانستان میں بدامنی کی وجہ پاکستان اور ہندوستان کا تنازع اور پھر وہاں ان دونوں کی ہراکسی وار ہے اس لیے صدر اوباما نے انہی انتخابی مہم میں یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کریں گے اور اس لیے انہوں نے ابتداء میں جس افغان پالیسی کا خاکہ پیش کیا اس میں افپاک کے / ساتھ ساتھ ہندوستان کو بھی شامل کیا گیا تھا لیکن بعد میں ہندوستان کے احتجاج کی وجہ سے افپاک سے ہندوستان کو الگ کر دیا گیا۔ گزشتہ سولہ سالوں میں آپ نے پاک ہند تنازع کو حل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ چین کے تناظر میں ہندوستان آپ کا اسٹریٹیجک پارٹنر بن گیا اب آپ اسے افغانستان کا وارث بنانا چاہتے ہیں یہ تو وہی مثال ہی کہ اگر میکسیکو میں بحران ہوا اور اس کو حل کرنے کے لیے کوئی قوت شمالی کوریا کو لا کر وہاں کا مختیار بنانا چاہے تو کیا امریکہ اس قوت سے تعاون کرے گا؟

۹/۱۱ ایک عام واقعہ نہیں تھا بلکہ ایک SuperPower پر حملہ تھا اس حملے کا جواب اسی حالت میں ملا جس قدر ایک سپر پاور سے توقع کی جا سکتی ہے ناول ساسا میں ۹/۱۱ کے واقع کا تذکرہ آتا ہے جس کو ہم ناول کا عروج کہہ سکتے ہیں جب ناول نگار ہمارے سامنے ۹/۱۱ کے بعد کی حالت اور ایک عالمی نظام کا ذکر کرتے ہیں سی لیے ہم مختصراً ۹/۱۱ کے واقع کو دیکھتے ہیں۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء ایک ایسا دن تھا جس کے بعد کہا جانے لگا اب دنیا پہلے جیسی نہیں رہے گی اور یہ بات درست تھی دنیا بدل گئی امریکہ کے مقامی وقت سے ۸:۴۵ پر دنیا کے معروف ترین شہر کی مصروف ترین بلڈنگ WorldTradeCenter جو اپنی ۲۱۰ منزلہ عمارت کے ساتھ نیویارک کی شناخت اور امریکہ کا فخر تھی جہاں ۵۰۰۰۰ مرد و زن مختلف امور سرانجام دیتے اس عمارت کی گہما گہمی شروع ہو چکی تھی۔ ہزار ہا کارکن اس کے جڑواں ٹاورز میں خوش و خرم دن کا آغاز کر چکے ہیں اچانک ایک جہاز عمارت کے حصے سے آکر ٹکراتا ہے اور اس کی ۱۰ منزلیں ملبے کا ڈھیر بن کر نیچے آگرتی ہیں ابھی کوئی صورت حال کو سمجھ نہیں پاتا ہے کے ۱۸ منٹ بعد دوسرا جہاز ٹاور سے جا کر

ٹکراتا ہے اس بار نشانہ دوسرا حصہ بنتا ہے اور اس کے انہدام کا خوف ناک عمل شروع ہو جاتا ہے۔

۴ جہاز اغواء کئے گئے جن میں ۲۵۵ مسافر سوار تھے جب کہ ہائی جیکروں کی تعداد ۱۹ تھی۔ اس وقت امریکہ کی فضاء میں ساڑھ ۸ ہزار جہاز پرواز کر رہے تھے چاروں جہاز اغواء کاروں نے امریکہ کے ایلیٹ کوسٹ سے اغواء کئے دو جہاز بوسٹن سے اغواء ہوئے جہازوں کی منزل کیلیفورنیا تھی۔

امریکہ ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۱۱ نے ۷:۵۹ منٹ پر بوسٹن سے لاس اینجلس کے لیے اڑان بھری اس میں ۸۱ مسافر اور عملے کے ۱۱ ارکان شامل تھے یہ پرواز ۸:۴۵ منٹ پر ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے نارتھ شمالی ٹاور سے ٹکرائی تھی۔

یونائیٹڈ ائیر لائن کی پرواز ۱۷۵ نے بوسٹن ائیر پورٹ سے ۷:۵۸ منٹ پر ہی اپنی اڑان بھری اس میں ۵۶ مسافر اور عملے کے ۹ ارکان سوار تھے یہ پرواز لاس اینجلس کی طرف جا رہی تھی یہ پرواز بوسٹن کے (لوگن) ایئر پورٹ کے ٹرمینل نمبر ۲۶ سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئی تھی جس میں ۲ عربی سوار تھے۔ اس جہاز میں ۵ چاقو بردار سوار تھے جنہوں نے چاقوؤں کے بل پر جہاز کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ جہاز ۹:۳۰ منٹ پر WTC کے جنوبی ٹاور سے ٹکرایا۔ ایک جہاز واشنگٹن میں امریکی محکمہ دفاع کی عمارت پینٹاگون کے ساتھ ٹکرا کر تباہ ہوا جبکہ ایک جہاز پنسلوانیا میں گر کر تباہ ہو گیا۔

امریکی صدر بش اور کانگریس کی درخواست پر ۲۶ نومبر ۲۰۰۲ء کو ۹/۱۱ حملے کی تحقیقات کے سلسلے میں ایک کمیشن قائم کیا گیا تاکہ اصل محرکات کو جانا جاسکے کمیشن کے چیئرمین تھامس ایچ کین اور وائس چیئرمین لی ایچ ہمٹن تھے اس کے علاوہ اس کمیشن میں ۸ ارکان شامل تھے کمیشن نے سانحہ کے ۴۴۱ دن بعد ۲۲ جولائی ۲۰۰۴ء کو ایک کتاب کی شکل میں رپورٹ پیش کی یہ رپورٹ ۵۸۵ صفحات پر مشتمل تھی کمیشن نے رپورٹ کی تیاری کے سلسلے میں دس ممالک کے تقریباً ۱۲۰۰ افراد سے تشویش کی جبکہ دستاویز کی صورت میں ۶۰۰۰۰۰ صفحات کا مطالعہ کیا۔

رپورٹ کے مطابق ۱۱ ستمبر کے حملوں کی ذمہ داری القاعدہ تنظیم تھی ہر جہاز می ۵،۵ جبکہ فلائٹ نمبر ۹۳ میں ۴ ہائی جیکر سوار تھے رپورٹ کے مطابق ان افراد میں جو ملوث تھے یا معاونت کر رہے تھے اسامہ بن لادن، خالد شیخ محمد، سید نحاجی، محمد حیدر زمار، ابوزبیدہ، زکریا موساوی وغیرہ شامل تھے۔

۹/۱۱ کمیشن نے ۹/۱۱ کی منصوبہ بندی اور پس منظر کے بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ۹/۱۱ حملوں کی منصوبہ بندی ۱۹۹۹ کو افغانستان میں کی گئی تھی ان ہموں کا مسٹر مائنڈ خالد شیخ محمد اور اسامہ بن لادن کو قرار دیا گیا۔ ۹/۱۱ ایک سیاسی واقعہ بھی تھا جس کے بعد پاکستان اور امریکہ کے سیاسی حالات پر بھی فرق آیا اور اس واقعہ نے روزمرہ کی زندگی کو بری طرح متاثر کیا۔

ناول ساسا میں موجود تہذیبی اختلافات پر ہم پہلے بات کر چکے ہیں اور ان کی نشاندہی کرنے کی بھی کوشش کی تھی اب ان تہذیبی اختلافات کو مد نظر رکھتے ہوئے سیاسی و مذہبی تناظر میں ان کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ ادب زندگی کی ترجمانی کر رہا ہوتا ہے اور زندگی پر تنقید بھی کر رہا ہوتا ہے ناول ادب کا ایک بنیادی حصہ ہے سو ناول میں جو کہانی ہمیں ملتی ہے وہ زندگی سے بھرپور ہوتی ہے اور معاشرے کے عمل دخل کے ساتھ موجود رہتی ہے۔ سیاسی و مذہبی تناظر دونوں تناظر معاشرے کے اہم تناظر شمار کئے جاتے ہیں اس لئے ادب کو ان تناظرات کی مدد سے بھی پرکھا جاتا رہا ہے۔

محبت جس کو متفقہ طور پر ایک آفاقی جذبے کی صورت میں تسلیم کیا جاتا ہے خود شناسی و خدا شناسی جیسے مراحل میں بھی محبت انسان کے ستہ سفر کرتی ہے محبت ایک معاشرے کی ضرورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اہم مرحلہ بھی ہے۔ انسان کی ماں سے محبت سر زمین سے محبت، دوست سے محبت وغیرہ جیسی ہمیں بہت سے مثالیں مل جاتی ہیں۔ محبت کا جذبہ جہاں دنیاوی زندگی کے ساتھ جڑا ہوا ہے وہیں مذہب میں بھی اس کی بڑی اہمیت ہے اس کی سب سے بڑی مثال خدا کی رسول اللہ کے ساتھ محبت اور رسول کے ساتھ وہ محبت جو ان کا ہر امتی کرتا ہے اور اس محبت کو اپنی جان و مال عزیز و اقارب سے اس محبت کو فوقیت دیتا ہے۔ ناول ساسا کے آغاز میں ہی ہمارے سامنے ایک عجب سوال آ کر کھڑا ہو جاتا ہے جو اپنے اندر تفصیل بھی رکھتا ہے اور استغفار بھی، محبت کے حصول کے الگ الگ زاویے ہوتے ہیں اور مختلف حیثیتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ بنیادی بات یوں ہے کہ ناول نگار کسی متلاشی سے پوچھتا ہے کہ اس کو کیا چاہیے جو اب ملتا ہے اس کو محبت کی تلاش ہے جب اس تلاش کی وجہ پوچھی جاتی ہے تو متلاشی حیران کن اعتراف کرتا ہے کہ اسے زندہ رہنے کے لیے محبت چاہیے یعنی کے محبت کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ پائے گا ناول کے بنیادی کردار سلیم کے ساتھ بھی ہمیں یہی مسئلہ نظر آتا ہے کہ اسے محبت کی تلاش ہے اس سوال میں یک دم حیرانی کا پہلو آ جاتا ہے جب متلاشی کو یہ معلوم پڑتا ہے کہ محبت کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔

آغاز، وسط اور اختتام یہ بنیادی مراحل ہوتے ہیں ان تین مراحل کے درمیان ایک مرحلہ کلائمکس کا بھی آتا ہے جس سے مرد یہ ہوتی ہے کہ کہانی یا فن پارہ اپنے عروج پر پہنچ چکا ہے اس سب چیزوں کی مدد سے فن پارے کی تقسیم میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

ناول کے آغاز میں ہمیں ایک گاؤں کا ماحول نظر آتا ہے جس میں ناول نگار نے مناسب وضاحتوں سے کام کیا ہے اس میں ایک اسکول کا ماحول ہے اور ماسٹر جی ہیں حکم ہونا مختلف اس طرح کی غیر مادی اشیاء کو ڈھونڈ نکالنے کا جو بھرپور توانائی کے ساتھ اپنا وجود تو رکھتی ہیں پر ان کو دیکھا نہیں جا سکتا ہے بلکہ بھرپور توانائی کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا

ہے ماسٹر جی کا کردار بہت سارے ایسے لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے جو لٹ کٹ ہر وطن عزیز پہنچے اور کسی طریقے سے بھی زندگی گزرنے کے قابل ہو گئے سلیم کو ایک سوال ملتا ہے کہ وہ یہ بتائے کہ محبت کہاں موجود ہے؟ گاؤں کی زندگی جو ہمیں ناول میں بتائی گئی دکھائی گئی ہم اس سے بخوبی واقف ہیں لیکن اس زندگی کا کسی دوسرے معاشرے سے تقابل مشکل ہو جاتا ہے ایک طرف پورا دن کھیلتے کودتے بچے اور ناقص تعلیمی نظام اور دوسری جانب (امریکہ) جو خود کو سب سے زیادہ تہذیب یافتہ ملک کہلواتا ہے اس کے ہاں تعلیمی نظام کسی بھی صورت ہمارے مقابلے کے معیار کا نہیں ہے ہماری دیہات کے بچے کو ماں پالی ہوئی بکریوں کا علم تو ہوتا ہے لیکن وہ اس بات سے ناآشنا ہوتا ہے کہ اس نے اگے بڑھ کر کرنا کیا ہے یہاں جو سب سے اہم مسئلہ ہے وہ ترجیحات کا ہے ہم اس بات پر ہی سوچتے ہیں اس کے فروغ کے لیے کوشش کرتے ہیں جو بات ہماری ترجیح میں شمار کی جاتی ہے۔ مذاہب کے ہاں ہمیں سادگی اور رواداری کا درس ملتا ہے لیکن مذہب کی شرح کرنے والے لوگ اکثر اوقات عام عوام کے سامنے ایسے بیان کر جاتے ہیں جس سے عوام میں جست جو، تلاش، اپنے حق کا معیار، خودی کا تعین اور سماج میں پائے جانی والی برائیوں کو وہ من و من قبول کرتا چلا جاتا ہے صرف و صرف فکر آخرت میں وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ خدا نے زمین پر اسے اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے اس کے کچھ آدرش ہونے چاہیں کیونکہ اس کے اوپر ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ سیاسی سطح پر ہماری ملک میں جو بھی حکومت قائم ہوتی ہے اس سے اس نوعیت کے سوالوں کا سلسلہ ہی نہیں ہو پاتا ہے کہ بھائی صاحب! آپ اتنا عرصہ حکومت میں رہے ہیں کیا آپ نے تعلیمی سرگرمی کے حوالے سے کوئی خاطر خواہ کام کیا ہے؟ ناول سے ہمیں بے شمار جگہوں پر تقابلی فضاء مل جاتی ہے جیسا کہ یونی ورسٹی کی تعطیلات کے ساتھ ہی طالب علم کوئی کیمپنگ کا منصوبہ بناتا ہے تو کوئی کسی دانش ور سے ملاقات کا کوئی سیر سپاٹے کرنے تو کوئی پوری دنیا کو کھوجنے کے عزم سے نکل آتا ہے ہمارے ہاں یونی ورسٹی کی تعطیلات کے بعد کیا فضا ہوتی ہے یہ ہم بخوبی جانتے ہیں۔

> ویزا لینے امریکی سفارت خانے میں ایسی ایسی چیزیں اتر کر گیا جنھیں کبھی مسجد میں بھی اتارنے کا نہیں سوچا تھا اپنی مٹی کا منکر بن کر پردیس روانہ ہوا۔ ثقل زمین سے بغاوت کر کے کوئی بیس گھنٹے ہزاروں فٹ کی بلندی پر اڑتا رہا شکاگو ائیر پورٹ پر تین گھنٹے الو بنا بیٹھا رہا تاکہ امریکی سیکورٹی اہلکار یہ طے کر سکیں کہ میں دہشت گرد نہیں ہوں۔[۷]

اس اقتباس میں سلیم اپنے ساتھ پیش آنے والی صورت حال کا تذکرہ کر رہا ہے جو بحیثیت مجموعی ہماری پوری قوم کا المیہ ہے آج بھی جب کوئی پاکستانی دور دیس کا سفر کرنا چاہتا ہے تو اسے بالکل ایسی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ایک بڑی خراب صورت حال ۹/۱۱ کے وقت سے پیدا ہو گئی دوسری جانب اسامہ بن لادن بازیاب بھی پاکستان سے ہوا تو کیوں دنیا ہمارا اعتبار کرے۔ اس میں سارا قصور Super Power کی انتقامی کاروائی کا ہی نہیں بلکہ کچھ

ہمارے لوگوں کا بھی ہے سمگلنگ اور گھر قانونی طریقے سے سفر اور سفر میں کوکین اور منشیات کی سپلائی جیسے بے شمار واقعات سامنے آچکے ہیں۔ جہاں ایک جانب دنیا کو یہ یقین دلانے کی ضرورت ہے کہ ہم پرامن لوگ ہیں وہیں دوسری جانب ہمیں یہ بھی ثابت کرنا ہے کہ اہم تہذیب یافتہ لوگ ہیں وگرنہ آج بھی دنیا میں دہشت گرد سمجھتی ہے اور اسامہ بن لادن کے نام سے پہچانتی ہے۔ ادب میں اور زندگی میں ہر انسان کوئی نا کوئی تصور یا کچھ بات ماطوق انفطرت عناصر لیے سفر کر رہا ہوتا ہے ہمارے ہاں تو ایک پورا دور اس حوالے سے گزرا داستانوں میں مرکز محور کیا چیز ہوتی تھی وہ یہی غیر حقیقی اور مافوق الفطرت عناصر ہی ہوا کرتے تھے جب سلیم ایک کہانی امریکی جریدے میں چھپنے کے لیے بھیجتا ہے تو وہ یہ کہ کر Reject کر دی جاتی ہے کہ ہمارا قاری تو حقیقت پڑھنے کا عادی ہے اس کو تو یہ کہانی سمجھ نہیں آئے گی۔ بیانیے جو ہمارے سامنے ہوتے ہیں ان کے سچا ہونے کی دلیل کوئی نہیں ہوتی ہے یہی بات ہے کہ بیانیے عوامی سطح پر بنتے، ٹوٹتے اور بکھرتے رہتے ہیں انڈیا ہمارا دشمن ہے اب اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ یہ دشمن کیوں جبکہ علیحدگی ہو چکی ہے کیا سرحدی بنیادوں کی وجہ سے مسئلہ کشمیر کی وجہ سے وغیرہ وغیرہ اب جب اس دشمنی کو دوستی میں تبدیل کرنے کے اقدامات کئے جاتے ہیں تو دونوں طرف سے ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ دوبارہ دشمن کی دیوار بن جاتی ہے آخر کسی کو تو اس سب سے فائدہ حاصل ہو رہا ہے اسی طرح امریکہ کے حوالے سے ایک بیانیہ عوام میں دیکھنے کو مل جاتا ہے خصوصا ان طبقات کی طرف سے جو افغان پسند اور طالبان دوست ہیں کہ یہ جو سب کچھ گڑ بڑی ہے اس کے پیچھے مکر امریکہ کا ہاتھ شامل ہے۔ اس طرح کے سیاسی دوغلے پن کو ناول نگار نے ہند مخالف نعروں سے اشارہ دیا ہے جو باتھ روموں کی زینت ہوا کرتے ہیں۔

ناول کے پینتیس صفحات کے بعد ناول نگار اہم کردار سلیم کی وضاحت کرتا چلا جاتے ہیں۔ اس میں ہمیں سلیم کا سماجی پس منظر آتا ہے سلیم کے اینا اور جینی کے تعلقات کے متعلق آگاہی ہوتا ہے۔ The Skies ہاسٹل میں رہتے ہوئے سلیم کی واقفیت اور دل چسپیاں نظر آتی ہیں، کرداروں کا تعارف کروانے کے ساتھ کہانی اپنا سفر جاری رکھتی ہے فلپائنی باورچی میڈی سے سلیم کا رشتہ مسافرت کے علاوہ غریب ملکوں کی قومیت کا بھی تھا وہ پچھلی ایک دہائی سے امریکہ میں مشقت کر کے فلپائن میں موجود اپنے خاندان کے مستقبل کے خدوخال سنوارنے کے خواب دیکھ رہی تھی اس کا خاوند بولڈر کے مضافات میں ایک زرعی فارم پر کام کیا کرتا تھا اور ہفتہ وار چھٹی میڈی کے ساتھ ہاسٹل میں گزارا کرتا تھا۔

۹/۱۱ کے بعد صدر بش کی طرف سے یہ واضح طور پر کہہ دیا گیا تھا کہ اگر آپ ہمارے ساتھ نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ہمارے خلاف ہیں یہیں سے ایک علیحدہ تصور پیدا ہو گیا یہ بات اتنی نئی نہیں ہے بلکہ یہ تصور

پہلے سے ہی موجود ہے (WE) یا (Others) یہ دو عام الفاظ پیدا ہیں لیکن ان کی بنیاد پر ایک بہت بڑی تفریق پیدا ہوتی ہے ہم صرف ہم ہیں اور جو دوسرا ہے وہ ہم نہیں ہو سکتا ہے ہمارے اور دوسرے میں بہت فرق ہے یہ ام انسانی رویہ بھی ہے جس کی مثالیں چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے انسانی زندگی کے مرحلے میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ افغانستان پہلے اور اس کے بعد عراق دونوں ایسے ملک تھے جو امریکہ کے عتاب کا نشانہ بنے ہے یہ بات اتنی سادہ نہیں کہ طالبان، القاعدہ یا کسی بھی تنظیم نے امریکہ کے WTC پر حملہ کر دیا اور امریکہ نے جوابی کاروائی کی شکل میں دشمن کو ڈھونڈا اور مارنا شروع کر دیا افغانستان کی حد تک تو یہ بات سمجھ آتی ہے لیکن عراق کی جانب جانا اس بات کا ٹھوس جواب نہیں ملتا ہے خود امریکی دانشور اس طرح کے بیان دیتے ہیں کہ یہ حملہ امریکہ کا خود کا کروایا گیا ہے تا کہ اس کو کوئی جواز مل سکے ان علاقوں کی طرف جانے کا۔اینا ارو لیش کے ملاقات کے موقع پر ناول نگار نے اس WE/Others کے تصور کو خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ہمارے تعلیمی اداروں میں حصول علم کا بڑا مقصد نوکری کرنا ہوتا ہے تا کہ چار پیسے کما کر زندگی گزاری جاسکے جبکہ علم کا مقصد تو ذات کی تسکین اور کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھانا ہونا چاہیے دین اسلام کی رو سے بھی ہمیں کائنات میں غور و فکر کرنے کا حکم ملتا ہے لیکن ہماری فطرت میں اجداد کی اعلیٰ علمی روایات نہیں صرف نوکری کا حصول ہے۔اس کے لیے کوشش کرنا بری بات نہیں لیکن صرف اس کو ہی اپنا مقصد جان لینا قابل مذمت بات ہے۔

> کولوراڈو یونیورسٹی کے خلائی ٹیکنالوجی کے پیج پر یہ خبر تھی کہ ڈیپارٹمنٹ نے مریخ پر مصنوعی سیارہ بھیجے اور وہاں کی مٹی کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک ملٹی بلین ڈالر کا میگا پراجکٹ حاصل کر لیا ہے۔[۵]

مندرجہ بالا اقتباس حصول علم کے مراحل اور ترجیحات کا منہ بولتا ثبوت ہے عین ممکن ہے کہ اس تحقیق کا کوئی فائدہ نہ ہو لیکن کم از کم یونیورسٹی کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے مراعات تو دی جارہی ہیں!

سرمایہ داری جس کا تعلق پراڈکٹ سے جڑا ہے اور اپنے اندر ایک خاص یا پھر یوں کیسے کہ ایک جابرانہ روایت رکھتی ہے۔ سلیم جو کہ ناول نگار کا تخلیق کیا گیا نمائندہ کردار ہے ناول میں ایک کوئی کردار ایسا لازمی ہوتا ہے جس کے ذریعے سے ناول نگار اپنی علمیات کا اظہار کرتا ہے اور اپنے نظریات کی ترویج کرتا ہے اس ضمن میں سلیم اور خادم صاحب کے درمیان مقالمہ ایک اہم فکر کو ظاہر کرتا ہے خادم صاحب کہتے ہیں:

اس جہاں میں سرمایہ دار سے بڑا کوئی تخلیق کار نہیں ہے۔ سرمایہ دار پہلے ایک خلل بنا کر ہمارے دماغ میں ڈالتا ہے ہم اس خلل کو لے کر پاگل ہونے لگتے ہیں تو سرمایہ دار چالاکی کے ساتھ اس خلل کا علاج ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے اور ہم قطار در قطار اس علاج کو خریدنا اور ذخیر اندوزی کرنا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ یہ جو بیماریاں ہیں یہ خود لیبارٹریوں میں پیدا کی جاتی ہیں اور پھر اس کی ویکسین بیچ کر سرمایہ دار سرمایہ کمانا شروع کر دیتا ہے۔یہی معاملہ بین

الاقوامی کھیلوں کا ہے سب سے پہلے وطنیت کا خلل بنایا جب ہم قومی ترانوں کے خمار میں جھومنے لگے تو کھیل بنا ڈالے، جیت کا خلل بناڈالا اور جب ہم جیت کا خلل لے کر TV کے آگے جا بیٹھتے ہیں تو اس نے ہماری ٹیم پر پردہ ڈالا اور ہمارے سامنے پیپسی رکھ دی اور پھر بار بار رکھنی شروع کر دی۔ ہم بیٹھے تو میچ دیکھنے کے لیے تھے لیکن اسی خمار میں اپنا لسی شربت بھول کر پیپسی پینے لگ گئے۔ خادم صاحب سلیم کی مخاطب کرتے اور بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کیا تمہیں اس بات میں کوئی سانحہ نظر نہیں آتا ہے کہ کچھ میٹرک فائل لڑکے ایک ڈنڈے کی مدد سے چمڑے کے ایک گول ٹکڑے کو پیٹ رہے ہوں اور کروڑوں لوگ اس عمل کو اس قدر معنی خیز سمجھتے ہوں کہ اپنی زندگی کی ساری معنویت کو بھول بیٹھیں؟ اپنے آپ کو بھول بیٹھیں؟ عشاق عشق کو معطل کر بیٹھیں فاقہ کش بھوک کو؟ بیمار دوائی کو، روگی ہر جائی کو؟ پھر یار نام کی بناوٹی چیز کو حقیقت ماں کر اپنے TV توڑ بیٹھیں؟ بچوں کو پیٹ ڈالیں؟ کیا تمہیں یہ المیہ نہیں لگتا کہ تمہارے جیسا پڑھا لکھا شخص ایک ان پڑھ بلے باز کا لایعنی انٹرویو سننے کے لیے TV کے آگے الو بنا بیٹھا ہو؟ کیا تمہیں اس بات پر کوئی زبان نظر نہیں آتا کہ پانچ پانچ سو شاعر ایک ڈنڈے بعض کا آٹو گراف لینے کے لیے قطار بنائے کھڑے ہوں؟

ہم تہذیبوں کے حوالے سے تفصیل سے بات کر چکے ہیں کہ تہذیب بنتی کیسے ہے اور اس کی خصوصیات و امتیازات کس طرح جنم لیتے ہیں اب معاملہ کچھ اس طرح سے ہیں مشرق و مغرب دو الگ الگ تہذیبیں ہیں لیکن صورت حال تب تبدیل ہوتی ہے جب ان دونوں تہذیبوں کا تصادم ہوتا ہے اور یوں ان دونوں تہذیبوں میں کسی نا کسی شکل میں لین دین ہوتا رہا ہے چاہیے وہ مادی ضرورت کی اشیاء ہیں یا اخلاقی اقدار محبت بھی اس طرح اب ایک آہستہ کی شکل بن چکی مثالی تصور محبت کا تو اب بھی موجود ہے مغرب میں اور مشرق میں لیکن صرف اس حد تک کہ اس کی مثال دی جا سکتی ہے اب محبت کے زاویے تبدیل ہو چکے ہیں اور انہیں صرف اخلاق کی کسوٹی پر کسی حد تک پر کھا جا سکتا ہے۔

> یہی وجہ تھی کہ مجھے پہلی بار ایک منزل نما بھی دس ہزار میل دور جا کر نصیب ہوئی تو کیا اس روز میں اپنا سے کچھ دور ٹھہرا نہ گیا تھا؟ اگرچہ اپنا اسے میرا مشرقی حجاب تصور کرتی تھی مگر دراصل یہ احترام محبت تھا۔ یوں محبت کو بن چادر کے جالینا ہماری روایت نہ تھی۔ محب کے اس اہتمام کی لاج محبوب کو پیش ہو کر رکھنا ہوتی ہے ایسا ہی تو ہوا تھا سب کچھ۔[9]

مشرق کی روایت یعنی جو کہ سلیم کی اپنی روایت ہے تو سلیم کے خیال میں مشرق کے ہاں احترام محبت موجود جبکہ مغرب کے ہاں اس احترام کا تصور بھی نہیں پایا جاتا ہے بلکہ ہمارے ہاں کچھ لوگوں کی نذر میں محبت ایک حرام شے

ہے اس بات کا ادراک سلیم کو بچپن میں ہوتا ہے جب وہ محبت کی تلاش کے بارے میں گاؤں کے کسی باسی سے سوال کرتا ہے۔

سیاسی نقطہ نظر کے حوالے سے ناول میں سب سے اہم مقام نوم چومسکی کے دوست کی باتیں اور وہ نظم جو وہ سناتا ہے سب سے اہم ہے یہی سے ہمیں بین الاقوامی سیاسی تناظر کو دیکھنے میں مدد ملتی ہے اور نئے عالمی نظام کی اصطلاح کی وضاحت ملتی ہے امریکہ کی پالیسی اور پالیسی ساز ایک طرف اور دوسری جانب وہ لوگ جن کو اکثریت دانش ور کہتی ہے امریکی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ایک مقولہ ہے ہم اکثر وہی چیزیں دیکھ رہے ہوتے ہیں جو ہمیں دکھائی جا رہی ہوتی ہیں یہاں ناول نگار نے بھی اس دانش وروں کے حوالے سے اہم بات لکھی ہے۔ نوم چومسکی کے دوست کی لکھی نظم کا خلاصہ یہ ہے:

> پاکستان کے غریب بچے جو ہمارے لیے ٹوپیاں بنا کر اور شالیں بن کر بھیجتے ہیں ہم ان کے لیے ڈرون بھجواتے ہیں اور یہ کہ پاکستان کے وہ نوجوان جو پس غالب کے پھول بھجواتے ہیں ہم انہیں ڈرون کا تحفہ دیتے ہیں اور پاکستان کے وہ بزرگ جو ہمیں دعائیں دیتے ہیں ہم ان کی پھیلی ہتھیلیوں پر ڈرون کی آگ رکھ دیتے ہیں۔ [۱۰]

اس نظم کو سنانے کے بعد چومسکی کے دوست اس پر اعتراف کرتے اور تاسف کا اظہار کرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے ایک مجرم نے جرم سے توبہ کر لی ہو اور وہ ملت کی خدمت کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہو اس کے الفاظ یہ ہیں:

> خواتین و حضرت ان ڈرون حملوں میں پاکستان کے غریب بچے مر رہے ہیں، میں معذرت کرتا ہوں مگر مجھے ایک مرتبہ پھر کہنے دیجئے، حالانکہ خون ڈالر لگا کر پھول سے چہروں والے بچے مار رہے ہیں۔ ہم جنہیں ان بچوں کی مسکراہٹوں کے تحفے بھیجنے چاہیے تھے، موت کے پروانے بھجتے ہیں کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے امریکہ کے حکمت عملی ساز اداروں میں انسان نہیں شیطان بھرتی ہوتے ہیں۔ حاضرین میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرے اور آپ کے پیسوں سے بھیجے گئے ان ڈرونوں میں مارے جانے والے نوے فیصد لوگوں کو امریکہ کا نام تک معلوم نہیں ہے۔ نہ ہی انہیں یہ معلوم ہے کہ جنگیں کیوں ہوتی ہیں۔۔۔ جنگ کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے مال بنانا چاہے وہ پن اور گولی بیچ کر بنایا جائے یا مال غنیمت لوٹ کر سرمایہ داریت کا حصہ بنایا جائے۔۔۔ بھائیو! یہ جنگ یک طرفہ ہے۔ بہت ہی غیر متناسب۔ ۹/۱۱ کے بعد سے اب تک دہشت گردوں نے تو امریکہ کے صرف پانچ فوجی مارے ہیں مگر امریکہ مسلمان ملکوں میں کم از کم پانچ لکھ لوگوں کو بارہ راست یا بالواسطہ رزق خاک کر چکا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ظلم کا حساب ہماری اگلی نسلوں کو چکانا پڑ جائے۔ [۱۱]

اس بیان کو سننے کے بعد سلیم ایک سوال کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اسی زمین سے ہے جہاں سے ہر امریکی پھول گرائے جاتے ہیں سلیم شام کے حوالے سے سوال کرتا ہے کہ آج کل شام میں کیا ہو رہا ہے ؟ کہنے کو کہتے ہیں وہاں پیدا ہونے والی بے چینی کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ ہے اس سوال کے جواب میں وہ کسمکا جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ وہ ابھی تک شام کی صورت حال کا مطالعہ کر رہے ہیں تا وہ کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں یہیں سے ہمیں دانش وروں کے منافقت آمیز پیٹرن کا علم ہوتا ہے کہ سب حقائق اور نوعیات کو جانتے بوجھتے بھی یہ لوگ اس وقت تک شام پر بات نہیں کریں گے جب تک شام کے حالات کی خبریں اخبارات میں چھپنا نہ شروع ہو جائیں۔

تانثیت جو کہ ایک جانب بڑے پیمانے پر بحث ہونے والی ادبی تھیوری ہے تو دوسری جانب اس کی سماجی و سیاسی اہمیت بھی ہے اس تھیوری کی ابتدائی شکل ہمیں تعلیم نسواں یا حقوق نسواں کی شکل میں ملتی ہے دریدا نے جب لا مرکزیت کے بعد مرکز کی پابندی کو آ کر توڑا کہ مرکزی حیثیت صرف اسی چیز کو ہی نہیں دینی چاہیے جو ہمیں مرکز میں نظر آتی ہے بلکہ حاشیے میں موجود اشیاء کو بھی مرکزی حیثیت دے کر دیکھنا چاہیے سو اس طرح مرد مرکز کی صورت تبدیل ہوئی اور اگر عورت کا مرکز کا درجہ دیا جائے تو یہاں سے تانیثی تھیوری کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔

تانثیت کے حوالے سے پہلا بنیادی تھیسس یورپ میں پیش ہوتا ہے مگر یہ عورت اور مرد کے درمیان برابری کے مسئلے کو اجاگر کرتا تھا اس میں کسی خطے یا کلچر یا کسی سیاسی مسئلے کو بنیاد نہیں بنایا گیا۔ عورت کیوں مرد سے حقیر تر ہے اور عورتوں کو وہ سماجی حقوق کیوں میسر نہیں جو صرف مرد ہونے کی وجہ سے مرد کو عطا کر دیئے جاتے ہیں یہ وہی انسانی حقوق کا پہلا سوال تھا جو باقاعدہ تانیثی تحریک کے آغاز کا موجب بنتا ہے۔

تانیثیت جو کہ سیاسی حوالے سے ایک تحریک اور اپنے جمالیاتی یا ادبی حوالے میں تھیوری کہلائی جاتی ہے یہ ایک باقاعدہ رجحان کا نام جس کی ترجیحات پروان چڑھتی رہی ہیں جب دریدا نے آ کر کہا کہ حاشیے پر موجود اشیاء کو بھی مرکزی حیثیت لے کر دیکھنا چاہیے اس بات سے تانیثیت کا رجحان ایک باقاعدہ تحریک کی حیثیت اختیار کرنے لگا۔

ایلین شوالٹر نے انتقاد نسواں کی بنیاد رکھی اور اس کو تین مراحل میں تقسیم کیا ہے پہلے مرحلے کو نسوانیت کیا ہے جو ۱۸۴۰ء- ۱۸۸۰ء تک کا یورپ اور امریکہ کا معاشرہ ہے اس دور کی عورتوں کی تحریریں یا عورتوں کے لیے مردوں کی تحریریں عورتوں کے بنیادی حقوق کی جنگ لڑتی نظر آتی ہیں اس دور میں عورت ایک صنف کے طور پر اپنے حقوق کے دفاع کا تقاضا کرتی نظر آتی ہے اس کو برابری کی تحریک کہا جاتا ہے یعنی کہ عورت کو مرد کے برابر حقوق دیئے جائیں۔ دوسرے مرحلے کو نسوانی کہا ہے یہ زمانہ ۱۸۸۰ء سے شروع ہو کر بیسویں صدی کے آغاز تک کا ہے اس دور میں مردوں کے مطالعے کو مرکز نگاہ بنایا گیا ہے کہ ان کی تحریروں میں عورت کس روپ میں نظر آتی ہے عورت کی

سماجی حصہ داریوں پر بات کی جانے لگی ایک عورت کسی مرد سے کیونکر کم تر اس طرح کے بنیادی سوالات اس دور میں نظر آتے ہیں تیسرا مرحلہ ۱۹۲۰ء سے شروع ہو کر موجودہ دور تک پھیلا ہوا ہے عورت کیا ہے ؟ یہ اس مرحلے کا بنیادی سوال ہے شوالٹر نے اسے عورت کی خود شناسی کا مرحلہ کہا ہے۔

ناول ساسا میں کوئی ایسا کردار نہیں ملتا جس کو بھرپور تانیثی کردار کہا جاسکے اور نہ ہی ناول نگار کے ہاں ایسی کوئی کوشش نظر آتی ہے۔ ناول میں مشرق و مغرب کی عورت کے حوالے سے امتیاز ہے اور ناول نگار مغرب میں رہتے ہوئے ایک ایسے لڑکی تلاش کر لیتا ہے جس میں مشرقی خصوصیات پائی جاتی ہیں ناول میں جہاں عورت کو بیان کیا گیا ہے وہاں اس کے انداز و نفسیات کا ذکر ہے ذرا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

> جینی ایک اچھی لڑکی اور قابل محبت دوست تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیاء تھی۔ نسوانی ہچکچاہٹ تھی ، عورت پن تھا، دمرج اور دھرتا تھا اس لیے اس نے ساسا کی اوٹ لی ہوئی تھی۔ مگر اس کی یہ نرم خرامی اور آہستگی زچ کر دینے والی بھی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ اس قدر چالاکی سے ساسا کو استعمال کرتی کہ مجھے ساسا اور خود پر ترس آنے لگتا۔ [۱۲]

ایک اور جگہ جب سلیم کو یہ معلوم پڑتا ہے کہ جینی کی والدہ لیز بین ہے اور بڑے آرام سے جینی یہ بات سلیم کو بتا دیتی ہے مزید یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ آج تک اپنی دوستوں کو ڈیٹ کرتی ہیں سلیم اس اظہار پر حیران رہ جاتا ہے کہ کتنی سہولت کے ساتھ جینی یہ بات کر گئی اور جینی کی ماں امریکہ کے آزاد معاشرے میں عورت کا مقام بیان کرنے والا کردار ہے۔

عورت کا ایک ماضی ہے جس میں وہ ایک گھوڑی کی مانند ہے اس ماضی کی بنیاد اور اس گھوڑی کی رسی مرد کے ہاتھ میں ہے وہ جیسے چاہتا ہے چابک چلاتا ہے اس پر سوار ہوتا ہے اور اسے اپنی مرضی کے راستوں پر چلاتا ہے عورت حویلی کی اندھیر کوٹھری میں محصور ایک ایسا وجود ہے جسے خارج کی علامتوں سے ہم آہنگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ عورت کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ یا تو مرد اساس ہے یا مرد کی علمداری میں ہے ساری علامتیں، سارے اشارے، ساری جمالیات، سارا فلسفہ سب کچھ مرد اساس ہے یا مردوں کی تسکین و تسلی کا کھلونہ ہے تانیثی ڈسکورس میں بغاوت کے منی یہ نہیں ہیں کہ عورت مرد کی طرح ہو جائے بلکہ عورت مرد کے متوازی اپنے وجود کا انسانی و فطری اثبات چاہتی ہے کہ مرد اس کی شناخت ایک باوقار لیکن مختلف وجود کی حیثیت سے کرے آج کی عورت حکم و محکوم کے کھیل کے خاتمہ اور اپنی شناخت، انفرادیت، ترجیحات فکر اور جمالیات کو اپنے حوالوں سے تسلیم کروانے کی جدوجہد میں مصروف عمل ہے ظاہر ہے یہ عورت وہ نہیں ہو سکتی جس کا تصور عام طور سے جدید عورت کی جنسی ترجیحات اور اس کی بدنی آزادی سے کیا جاتا ہے۔ جو پابندیوں کی قائل نہیں ہے۔

اسامہ بن لادن جس کو ایک جانب مرد مجاہد کہا جاتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ پوری امت کی مجاہدانہ کاروائیوں کے سربراہ سمجھے جاتے ہیں حتیٰ کہ ہماری طرف سے بھی ہر طرح کی امداد فراہم کی جانے لگتی ہے دوسری جانب یہ بھی کہا جاتا ہے خود اسامہ بن لادن امریکہ کے CIA جیسے اداروں کی پیداوار ہیں امریکہ بہادر کی طرف سے بھی خاطر خواہ اصلحہ و ملی امداد القاعدہ کو فراہم کی جاتی رہی ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی صورت حال ہے ناول بھی اسامہ بن لادن کی گرفتاری کے ساتھ ہی اپنا عروج حاصل کر لیتا ہے کیونکہ اس کے بعد سے ہی سلیم کو رویوں کا اتار چڑھاؤ، غیر تحفظگی اور وطن کے نام پر ذلالت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ناول سیاسی حوالوں پر بھی پورا اترتا ہے کہ اس میں متن کی تہہ میں بھی ایک الگ متن پوشیدہ ہے جس طرح یہ جملہ ملاحظہ ہو:

> اس کی نظریں چھت پر ٹنگی میری ایک جراب پر ٹکی تھیں، جسے میں نے اس دن لیش پر غصہ کھا کر اچھالا تھا اور آج تک ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا ویسے ہی جیسے امریکہ بہادر اپنے ہی اچھالے ہوئے اسامہ بن لادن کو ڈھونڈنے میں ناکام رہا تھا۔ [۳۱]

ناول میں جب پاکستان کو زیر بحث لایا گیا تو اس طریقے سے کہ ارض پاک کی مکمل، جامعہ، سیاسی، سماجی و ثقافتی صورت حل کھل کر سامنے آجاتی ہے جب جینی پاکستان جانے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے تو سلیم سوچتا ہے کہ یہ وہاں جانا چاہتی ہے جہاں نفرتوں کی تبلیغ ہے اور محبت پر پابندیاں ہیں جہاں لوگ فاختاؤں کی جگہ عبادت گاہیں اڑانے لگے ہیں جہاں مسلمان تو کسی ایک کو بھی نہیں کہا جاتا بلکہ کافر و مشرق سب کو کر دیا جاتا ہے۔ ابھی ملک حالت جنگ میں ہے ابھی ارض پاک و پاک ہونے کے عمل سے گزر رہی ہے۔ ایسی جنگ چل رہی ہے جس کا ایندھن سپر پاور اور دوسری طاقتیں فراہم کر رہی ہیں اور کئی ایک برادر اسلامی ملک بھی۔ یہ آگ بجھاتے بجھاتے ہماری ماؤں کے آنسوؤں کا دریا خشک ہو گیا ہے، سیاگنوں کی منتظر آنکھیں پتھرا گئی ہیں بچوں کے ننھے ننھے خواب خاک ہو کر بکھرنے لگے ہیں لہو کا رواج اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ محبت کی جنس ہی نہ پید ہو کر رہ گئی ہے زمین پر اتنے بم برسے ہیں کہ وہ بانجھ ہو کر رہ گئی ہے ہواؤں میں اس قدر زہر گھولا گیا ہے کہ پرندوں نے ہمارے وطن کا رخ کرنا چھوڑ دیا ہے جو ان ترقی یافتہ ملکوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ بچے چھوٹے چھوٹے صحنوں میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں ہر طرف گھٹن ہے اب تو وہاں کی ہوا بھی ڈری ڈری رہتی ہے کہ کہیں بارود کو نہ چکھ لے اپنی آکسیجن کو شعلوں میں نہ جھونک بیٹھے۔

ایک جانب تو سلیم محبت کے حق میں ہے جبکہ دوسری جانب وہ اس سے پریشان بھی ہے ملک میں پھیلی نفرتیں جن میں ایک بڑا عمل دخل سیاسی ذرائع کا ہے کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

> یہ سب پیمانے میرے ملک میں بھی رائج ہیں مگر وہاں ایک اور چیز بھی تلاش محبت کے کھیل کا حصہ ہے اور وہ ہے نفرت اس نفرت کی بنیاد پر میرے لوگوں نے ایک مائنس فارمولا گھڑ لیا تھا محبت کی کھوج میں

> نکلنے سے پہلے، مائنس کمی، مائنس موچی، مائنس نائی، مائنس بیوہ، مائنس مطلقہ، مائنس شیعہ، مائنس سنی، مائنس پنجابی، مائنس مہاجر، مائنس سندھی، مائنسس رائیگی، مائنس کشمیری، مائنس پٹھان، مائنس بلوچ، مائنس براہوی وطن سے دور آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نفرت کی ایکویشن سے نکلے یہ فارمولے مجھ پر بھی لاگو ہوتے تھے۔ [۱۴]

ان جملوں کے بعد (بن لادن ان یور کنٹری، پاکستان، نات افغانستان) ناول کا ایک اور Phase شروع ہو جاتا ہے ۱۱/۹ کے واقعہ نے ہماری مجموعی حیثیت کو بری طرح سے خراب کیا تھا یہاں اب پاکستان سے اسامہ بن لادن کی بازیابی نے ایک بار بھی پاکستان کو مشکوک ٹھہرادیا وہ الگ بات ہے کہ امریکہ بہادر نے اسامہ کی بازیابی کے حوالے سے کوئی واضح ثبوت فراہم نہیں کئے اور یہ کہ دیا کہ لاش کو سمندر برد کر دیا گیا ہے ثبوت کے طور پر ایک کارٹونک وڈیو پیش کر دی جس پر کچھ لوگوں نے اعتراضات بھی اٹھائے کہ کہیں یہ ویسا ہی تو نہیں ہے کہ ۱۱/ ۹ نقلی اسامہ بن لادن سے ویڈیو بنوائی گئی جس میں وہ ۱۱/ ۹ پی کئے گئے حملوں کی ذمہ داری قبول کر رہے ہیں۔ سلیم اپنی حالت کے حوالے سے کہتا ہے:

> اگلے چند دن بھی TheSkies کا آسمان مجھ پر نامیزبان رہا میں حال میں داخل ہوتا تو سب آدھی ادھوری مسکراہٹ دیتے دور دور سے Hi بولتے اور آہستہ آہستہ غائب ہونے لگے نک نے حال میں آنے کی ٹائمنگ ایسے بدلی کہ ان سارے دنوں میں نظر ہی نہ آیا۔۔۔ کچن میں جاتا تو میڈی میوزک کی آواز اونچی اور نظریں نیچی کر لیا کرتی۔ [۱۵]

ایک جانب سادہ ہے تو دوسری جانب ساسا ہے سادہ ایک انسان ہے جو بم دھماکے میں مارا جاتا ہے کہ صرف اس کی چند بوٹیوں کی شناخت ہو پاتی ہے سلیم کو جب یہ خبر ملتی ہے تو وہ دکھ میں آجاتا ہے پھر یونی ورسٹی چلا جاتا ہے ساسا ایک پرندہ ہے جاندار ہے لیکن ساسا کی جان کبھی بھی سادہ کے برابر نہیں ہو سکتی ہے ساسا جب مرتا ہے تو سلیم کو چھٹی کرنا پڑتی ہے اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ کیسے لوگ ایک پرندے کے مرنے پر افسوس کا اظہار کر رہے ہیں جبکہ دوسری جانب پاکستان، افغانستان میں سینکڑوں لوگ روزانہ کی بنیادوں پر مر رہے ہیں ان کا شمار تو کسی گنتی میں نہیں ہوتا ہے یہ دیکھ کر سوچ کر سلیم بے ساختہ رونے لگتا ہے لوگ حیران ہوتے ہیں کہ یہ تو بہت نرم دل انسان ہے جو اپنی دوست کے پرندے کے مرنے پر اس طرح رو رہا ہے اگلے دن یہ خبر امریکہ کے اخباروں میں چھپی ہوتی ہے۔ امریکیوں کو احساس بھی کیسے ہو سکتا تھا ان کے تصور تاریخ کے مطابق جو لوگ مر رہے تھے وہ سب دہشت گرد تھے جو دنیا کے لیے خطرہ تھے۔

مذہب انسان کی رگوں میں رچا بسا ہوتا ہے اور اس کا اظہار شخصیت میں کہیں نہ کہیں موجود رہتا ہے کہاں امریکہ کی جرت آمیز ذہنی فکر اور کہاں پاکستانی سماج کی سوچ دونوں بڑی حد تک مخالف اور مختلف ہیں :

> جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کئی خداؤں نے مل کر اس باغ کو ان چٹانوں سے سجایا ہے۔اس پر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے جینی کو بتایا کہ اس کے اور میرے مذہب کے مطابق خدا ایک ہی ہے اور یہ کہ یہ بات عقل کو بھی نہیں لگتی ہے کہ ایک باغ بنانے کے لیے کئی خداؤں کی ضرورت پڑ ہو۔ جینی نے مجھے گھور کر دیکھا۔اس کی آنکھوں میں تشکیک تھی مگر وہ خاموش رہی۔[۱۶]

سلیم ایک اور جگہ ناول میں آگے چل کر جینی کو کہتا ہے:

> Jenny, I invite you to Islam. Please become a Muslim so our love.[۱۷]

یہ سن کر جینی یک دم حیران ہو جاتی ہے اور پھر خوف اور غصہ اس میں اترتا ہے سلیم اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھتا ہے مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اللہ کی حاکمیت کو قبول کرے اللہ کے نائب ہونے کی حیثیت سے اللہ کے حکم پر عمل کرے دین اسلام کی تبلیغ کرے لوگوں کو نیکی کی طرف لے کر آئے اور اسلام کی دعوت سے بڑھ کر نیکی اور کیا ہو سکتی ہے یہاں سلیم ایک مذہبی نمائندے کی صورت میں بھی نظر آتا ہے۔ جینی اسلامی کو صرف اور صرف خود کش حملہ آوروں کا مذہب سمجھتی ہے۔

ایک اور خبر گردش میں آجاتی ہے کہ کسی پاکستانی نے بوسٹن مراتھن (امریکہ) میں بمب پلانٹ کیا ہے یہ بہت مہلک بات تھی لیکن اس پر سلیم کے چند جملے نہایت فکر انگیز ہیں:

> میرے ملک کے لاکھوں لوگ آج بھی ایک خاموش دعا کرتے ہیں کہ خدایا یہاں جتنے دھماکے ہونے ہیں ہو جائیں امریکہ کے تمام ٹاوروں کو، چوکوں کو، سینما گھروں کو، اور گلیوں کو اپنی حفظ وامان میں رکھنا کیونکہ انہیں معلوم ہے امریکہ میں دھماکے کا ذمہ دار چاہے کوئی بھی ہو خراج ہماری دنیا کو ادا کرنا پڑتا ہے۔[۱۸]

مذہبی حوالوں سے یہاں اختلافات کو ناول نگار نے بڑی مہارت کے ساتھ واضح کیا ہے جینی سمیت ہاسٹل کے تمام لوگوں کا اچانک سے رویہ بدل جانا اسلام کو محض دہشت گردوں کا مذہب سمجھنا اور تصور کر لینا کہ مسلمان امریکی تہذیب سے کمتر تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں اس بات کا ثبوت ہے کہ امریکہ خود کو سپر پاور ہونے کی وجہ سے ایک بڑی تہذیب کا نمائندہ قرار دیتا ہے اور تیسری دنیاؤں سے تعلق رکھنے والے ممالک خاص طور پر اسلامی ممالک کو اپنے سے کمتر اور غیر مہذب سمجھتا ہے اسی امریکی فکر کو ناول ساسا میں سلیم کے کردار کے ذریعے پیش کیا گیا ہے ناول نگار نے

بڑی باریکی سے دونوں تہذیبوں کے اختلافات وتضادات کو اس خوبصورتی سے بیان کیا کہ نہ تو امریکہ کو بڑی اور مہذب تہذیب کا داعی قرار دیا اور نہ ہی اسلامی تہذیب خصوصاً پاکستانی تہذیب و ثقافت کو کمتر ظاہر کیا بلکہ آخر میں سلیم کا واپس اپنے گاؤں میں لوٹنا اور اپنی محبت کو اسی جگہ پانا جہاں سے تلاش محبت کا سفر شروع کیا تھا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر انسان اپنی تہذیب و ثقافت سے ہمیشہ جڑا رہتا ہے اور پردیس جا کر بھلے وہ کچھ وقت کے لیے خود کو کسی دوسری تہذیب کے رنگ میں رنگنا چاہے مگر چونکہ وہ ایک جدا اور منفرد تہذیب سے تعلق رکھتا ہے تو وہ ہر گز کسی دوسری تہذیب کو چاہ کر بھی اپنا نہیں سکتا۔

حوالہ جات

۱۔ علی عباس جلال پوری،تاریخ کا نیا موڑ (جہلم: فرد افروز پبلشرز،۱۹۸۷ء)، ص ۱۲۔

۲۔ سیموئل پی ہنٹنگٹن،تہذیبوں کا تصادم،ترجمہ محمد احسن بٹ، ص ۳۶۔

۳۔ اسٹیفن لی کاک،علم سیاست ترجمہ قاضی تلمذ حسین(دکن: جامعہ عثمانیہ،۱۹۳۳ء)، ص ۴۶۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۸۔

۵۔ بلجلی۔سیاست و علم سیاسیات،http:www.urdublog.9869، بتاریخ ۱۸ اپریل ۲۰۲۰ء، بوقت ۱۰:۳۶ بجے۔

۶۔ سلیم صافی،متبادل بیانیہ(اسلام آباد:DIR بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،۲۰۱۹ء)، ص ۴۳۸۔

۷۔ شیراز دستی، ساسا ، ص ۱۵۔

۸۔ ایضاً، ص ۵۵۔

۹۔ ایضاً، ص ۶۸۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۷۴۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۷۵۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۷۷۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۸۹۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۴۷۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۶۱۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۶۵۔

ماحصل

ماحصل

اردو ناول میں مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے اور مشرقی تہذیبوں پر مغربی تہذیبوں کے اثرات بیان کیے گئے ہیں۔ ان اثرات کو دیکھنے کے لیے اس مقالے میں شیراز دستی کے ناول سا سا میں تہذیبی کشمکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تاکہ اردو ناول پر تہذیبی کشمکش کے براہ راست اثرات کا مطالعہ کیا جا سکے۔ اس لیے اس ناول کی تہذیبی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مقالے کی بنیاد ہنٹنگٹن کی تھیوری پر رکھی گئی تھی۔

۱۹۹۳ء میں ہنٹنگٹن نے 'فارن افیئرز' کے لیے ایک آرٹیکل لکھا جس کا عنوان تھا تہذیبوں کا تصادم اس مضمون میں ہنٹنگٹن نے ایک مفروضہ قائم کیا کہ لوگوں کی تہذیبی و ثقافتی اور مذہبی شناختیں سرد جنگ کے بعد بنیادی تضاد کی وجہ ہوں گی مزید بحث کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ مستقبل میں جنگیں ملکوں کے درمیان نہیں بلکہ تہذیبوں کے درمیان لڑی جائیں گی۔

سیموئل نے اپنی کتاب کو پانچ (۵) حصوں اور دو (۲) ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ تہذیبوں کی دنیا

۲۔ تہذیبوں کا بدلتا ہوا توازن

۳۔ تہذیبوں کا ابھرتا ہوا نظام

۴۔ تہذیبوں کے تصادمات

۵۔ تہذیبوں کا مستقبل

پہلے حصے میں عالمی سیاست کے نئے ادوار۔ تاریخ اور زمانہ حال کے تناظر میں تہذیبیں جدیدت اور مغربیت کو بیان کیا ہے دوسرے حصے میں مغرب کا زوال اور اس کے ممکنات اور معاشیات آبادی اور چیلنج کرنے والی تہذیبیں جیسا کہ مسلم تہذیب کی خصوصیت وہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کے ہاں ایک تصور افزائش نسل کا ہے۔ تیسرے حصے میں سیموئل عالمی سیاست کی نئی تشکیل اور مرکزی ریاستیں چوتھے حصے میں جن کو سیموئل نے تہذیبو تصادمات کا نام دیا ہے اس میں بین التہذیبی مسائل، تہذیبوں کی عالمی سیاست، عبوری جنگیں اور تقسیمی خط کی جنگیں اور تقسیمی خط کی جنگوں کی حرکیات پر بات کی ہے۔ پانچویں اور آخری حصے میں تہذیبوں کے مستقبل پر بات کی ہے سیموئل کتاب کے دیباچے میں ہی اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ اس کتاب میں عالمی سیاست میں رونما ہونے والے تمام واقعات کو زیر بحث نہیں لایا گیا بلکہ بین الاقوامی سیاسی ارتقاء کی تقسیم کے لیے ایک بھرپور زاویہ نگاہ پیش کیا گیا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ

کوئی بھی فلسفہ حتمی ہونے کی سند لے کر نہیں آتا ہے تہذیبی زاویہ نگاہ ۲۰ ویں صدی کے اختتام اور ۲۱ ویں صدی کے آغاز میں عالمی سیاست کے نشیب و فراز کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس زاویہ نگاہ سے ہم گزشتہ صدی کے درمیانی عرصے کے حالات کے اتار چڑھاؤ کو بھی سمجھ سکیں۔اس کے بنیادی نکات یہ تھے۔

۱۔ کوئی مہذب معاشرہ کسی قدیم معاشرے سے اس لیے مختلف ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک نظم وضبط ہوتا ہے یہ معاشرہ شہری ہوتا ہے اور اس کے افراد تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔

۲۔ تہذیب کا مطلب ہے چند مراعات یافتہ افراد یا گروہ، لیکن یہ بات بھی درست ہے ایک تہذیب اپنے اندر تہذیب یافتہ ہوتی ہے۔

۳۔ تہذیبیں مزید تہذیب یافتہ ہو رہی ہیں کہ نہیں؟ وہ عروج کی طرف یا نئی علوم کی طرف سفر کر رہیں یا ان کا زوال ہو چکا ہے۔

۴۔ جرمن فلسفیوں کے مطابق تہذیب وہ ہوتی ہے جو طاقت اور ٹیکنالوجی پر محیط ہوتی ہے جبکہ ثقافت کسی معاشرے کی اقدار اعلیٰ ترین فلسفیانہ اور اخلاقی صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔

۵۔ بشریات ماہرین کے مطابق ثقافت، قدیم، جامد، غیر شہری معاشروں کی خصوصیت ہوتی ہے۔اس کے برعکس پیچیدہ، ترقی یافتہ، شہری اور حرکت پذیر معاشرے تہذیب کہلاتے ہیں ثقافت اور تہذیب کے حوالے سے کچھ بحث ہم آگے چل کر کریں گے۔

۶۔ تہذیب ہو یا ثقافت ہو دونوں ہی افراد کے اجتماعی انداز زیست کی ترجمانی کرتے ہیں۔

۷۔ تاریخ انسانی کی بڑی تہذیبیں اعلیٰ ترین سطح پر دنیا کے عظیم ترین مذہبوں پر استوار تھیں جو لوگ نسلی اور لسانی اعتبار سے ایک مگر مذہبی اعتبار سے الگ الگ ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کے سخت دشمن ہو سکتے ہیں جیسے لبنان، سابق یوگوسلاویہ اور برصغیر۔

۸۔ کوئی بھی تہذیب ہو وہ ایک وسیع ثقافتی وحدت ہوتی ہے۔

۹۔ تہذیبیں (ہم) ہوتی ہیں جس کے احاطے میں ہم اپنے آپ کو دوسرے (وہ) سے الگ کرتے ہیں کچھ تہذیبوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے جیسے کہ چینی تہذیب کچھ تہذیبیں بہت کم افراد پر مشتمل ہوتی ہیں جس طرح اینگوفون کیریبئن تہذیب۔

۱۰۔ تہذیبوں کی سرحدیں نہیں ہوتی ہیں اور نہ ہی ان کا آغاز وانجام کیونکہ تہذیب ایک لمبے تاریخی تسلسل پر مشتمل ہوتی ہے افراد اپنے تشخص میں تبدیلی لاتے ہیں جس وجہ سے وقت گزرنے کے ساتھ تہذیبوں کی

بناوٹ میں تبدیلی آتی ہے۔

۱۱۔ تہذیبیں فنا بھی ہوتی ہیں وہ جامد نہیں متحرک ہوا کرتی ہیں وہ بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں جیسا کہ ہم نے آغاز میں کہا کہ تہذیبیں وقت کے صحرا میں دفن بھی ہو جاتی ہیں۔

۱۲۔ تہذیب کے ساتھ ایک ریاست ہوتی ہے آج کی دنیا کی اکثر تہذیبیں ایک سے زیادہ ریاستوں پر مشتمل ہیں۔

تہذیبوں کا مستقبل سیموئل کی کتاب کا آخری اور اہم باب ہے جس میں انہوں نے بہت سے اہم نکات اٹھائے ہیں جن کو اختصار کے ساتھ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

۱۔ جو معاشرے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی تاریخ ختم ہو گئی ہے وہ ایسے معاشرے ہوتے ہیں جن کی تاریخ زوال کا شکار ہوتی ہے۔

۲۔ اسلامی احیاء اور ایشیاء کی معاشی ترقی سے پتا چلتا ہے کہ دیگر تہذیبیں زندہ ہیں اور مغرب کے لیے ایک خاموش خطرہ ہیں۔

۳۔ مغرب کے معاشرہ اخلاقی زوال کا شکار ہوتا چلا جارہا ہے۔

۴۔ جن ملکوں کے رہنماؤں نے اپنے ثقافتی ورثے کو رد کر کے اپنے ملک کے تشخص کو ایک تہذیب کی بجائے دوسری تہذیبوں سے متعین کروانے کی کوشش کی وہ کامیاب نہیں ہوئے۔

۵۔ امریکہ کے لوگ جب اپنی جڑوں کی تلاش کرتے ہیں تو خود کو یورپ میں پاتے ہیں انکے پاس اس کا کوئی متبادل نہیں ہے۔

۶۔ امریکی حکومت ایک ایسے زمانے کو تسلیم کرنے میں غیر معمولی دشواریوں سے دوچار ہے جس زمانے میں عالمی سیاست کی تشکیل ثقافتی اور تہذیبی بنیادوں پر ہو رہی ہے۔

۷۔ امریکہ کو کثیر التہذیبی دنیا کے تقاضوں کو تسلیم کر لینا چاہیے۔

۸۔ یورپ اور امریکہ کو سیاسی معاشی اور فوجی روابط کو وسعت دینی چاہیے، یورپی یونین اور ناٹو کو توسیع دینی چاہیے، دوسری تہذیبوں کے اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہیے، دوسرے ممالک پر اپنی ٹیکنالوجی اور فوجی برتری کو قائم رکھنا چاہیے۔

۹۔ ابھرتے ہوئے نئے عہد میں تہذیبوں کے تصادم دنیا کے امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔

۱۰۔ اس تصادم سے بچنے کا ایک طریقہ تہذیبوں کی بنیاد پر قائم کیا جانے والا ایک بین الاقوامی نظام ہی ہے۔

ان تمام نکات کی مدد سے ناول ساسا میں تہذیبی کشمکش کو دیکھا گیا ہے۔ناول ساسا میں امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کے ساتھ کئے جانے والے ناروا سلوک کے حوالے سے ایک بیانیہ ملتا ہے کہ کس طرح ۹/۱۱ کے بعد ان کو سخت و خوفناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس وقت ناول نگار ایک اختلاف پر اپنا موقف قائم کرتا ہے۔

ناول ساسا میں ہمیں اختلافات کی صورت میں دو(۲) تہذیبیں ملتی ہیں ایک اسلامی تہذیب اور دوسری امریکی تہذیب ان کے ہاں بے شمار اختلافات موجود ہیں لیکن کچھ قدریں مشترک بھی ہیں۔ ناول کا تھیم پاکستان اور امریکہ کی لوکیل میں قائم کیا گیا ہے۔ پاکستان جہاں ایک اسلامی ملک ہونے کی وجہ سے اسلامی تہذیب کا علمبردار ہے۔ جبکہ امریکہ مغربی تہذیب کا علمبردار ہے۔اور یورپی تہذیبوں میں سب سے زیادہ مہذب سمجھا جاتا ہے۔

ناول ساسا میں ناول نگار پورے طریقے سے پاکستان و امریکہ کے تہذیبی پس منظر سے آگاہ ہیں اور وہ پاکستان کی اس وقت کی مجموعی تہذیبی صورت حال کو امریکہ کی معاصر تہذیبی صورت حال کے سامنے رکھتے ہیں انسان اور انسان کی قدر مشرقی تہذیب کی بنیاد میں شامل ہے اور اسلامی تہذیب کی سب سے بڑی خوبی ہے لیکن اب تہذیبی صورت حال اس قدر تبدیل ہو چکی ہے جہاں امریکہ میں ایک پرندے کے بیمار ہونے پر فوراً ایمبولینس آ جاتی ہے دوسری جانب روزانہ کی بنیاد پر سینکڑوں لوگ مرتے ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا ہے۔ یہ صورت حال ناول نگار نے ہمیں ایک تہذیبی المیے کی ہیت میں دکھائی ہے۔

تہذیبی اختلافات جہاں کلچر و ثقافت کے مباحث کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کرتے ہیں وہیں پر یہ کچھ پیچیدگیاں بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ناول ساسا میں یہ صورت موجود ہے۔

اگر موجودہ صورت حال میں کسی تہذیبی اختلاف کی بات کی جائے تو حال احوال الگ نوعیت کا ہو گا جیسا کہ اس تہذیبی مسئلہ کو پاکستان کے تناظر میں رکھ کر دیکھیں مثلاً سکول یا تعلیمی نظام کی صورت کو دیکھا جائے تو وہ اپنے تہذیبی تناظر کے ساتھ مقامی تناظر کو بھی زیرِ بحث لائے گا۔ ناول کے آغاز میں موجود اسکول کی تصویر دیکھی جائے تو ایک واضح امتیاز نظر آئے گا۔

دو الگ الگ رتیلوں کے درمیان دو الگ تہذیبوں کے درمیان فرق نظر آتا ہے۔ مختلف تہذیبیں یہاں نظر آتی ہیں،امیری کی تہذیب، غریبی کی تہذیب،اشرافیہ کی تہذیب، سفید پوشوں کی تہذیب،ایلیٹ کلاس کی تہذیب اور رزیل کلاس کی تہذیب۔

ایک جانب تو وہ بنیادی سوال محبت کے بارے میں ہے جس کا سامنا ہمیں ناول میں کرنا پڑتا ہے اور اس طرح کے چند دوسرے سوالات بھی کچھ بچوں کو تلاش کے لیے دیے جاتے ہیں لیکن اب گر ہم معاشرے میں ذہنی تربیت کو

دیکھیں تو ایک طرف وہ نسل ہے جو ٹاٹ پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کر رہی ہے جب کہ دوسری جانب وہ نسل ہے جس کی امنگیں نوم چومسکی سے ملاقات، شور پھاڑی کا سفر، دوسرے دیسوں کی سیر شامل ہے۔ یقیناً دوسری نسل کی ذہنی تربیت اور ابتدائے بچپن کے حالات پہلی نسل سے الگ رہے ہوں گے جو اس ناول میں ہمیں نظر آتے ہیں۔

صنفی امتیاز جو آگے چل کر ایک باقاعدہ رجحان اور تحریک بھی بن جاتا ہے جس کی گواہ پوری تاریخ فکر انسانی ہے جو جمالیاتی معنوں میں تانیثیت کہلاتی ہے۔ یہاں ناول کے سیاق میں کچھ ایسے معاشرے کا احوال ملتا ہے جہاں ہر کسی کو من چاہی زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ ناول نگار ناول کے سیاق میں ہمارے اس بیانیے کو توڑتا ہے جب جینی کے گھر والوں سے سلیم جا کر ملتا ہے اور اس کی ماں سے ملاقات کرتا ہے۔

تہذیب میں اختلاف کب پیدا ہوتا ہے کبھی تو اس کے لیے ایک طویل وقت درکار ہوتا ہے اور کبھی تو بہت قلیل عرصے میں تہذیب اپنے اہداف مقرر کر لیتی ہے ایسی ہی صورت ہمیں ۱۱/۹ کے بعد محسوس ہوتی ہے جب سلیم کے دوست نے اپنے خاص رنگ دکھائے اور پاکستان بحیثیت مجموعی اس تمام صورت حال میں بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا۔ پوری دنیا کے سامنے ہم دہشت گرد بن گئے اور ہمارے امن کے اوصاف دوسروں کی نظروں میں ایک دکھاوا بن کر رہ گئے۔

یہاں ناول میں کچھ اختلافات شدت سے دکھائے گئے ہیں۔ جب امن کو قائم کرنے کی خاطر اور امریکہ جیسے دوست کو خوش کرنے کے لیے ہمیں اپنے ہی لوگوں کے خلاف عسکری آپریشنز کیے تو تہذیبی اختلاف ہمارے معاشرے میں موجود دوستوں کی دوستی اور دوستوں کے دشمنوں کی دوستی جیسی عجیب صورت حال میں سامنے آتا ہے۔ تہذیبی اختلافات بعض اوقات ہم خود پیدا کرتے ہیں اور کئی دفعہ ہماری تہذیب اپنی اقدار کی روشنی میں کچھ اصول و ضوابط بنا لیتی ہے۔ یہیں سے یہ بحث شروع ہوتی ہے کہ تہذیبی اختلافات اور تہذیبی امتیازات میں کیا فرق ہے اور ایک تہذیب دوسری تہذیب کو کن معنوں میں متاثر کر رہی ہوتی ہے۔ یوں امریکی تہذیب نے براہ راست پاکستانی تہذیب کو متاثر کیا ہے۔

ناول سلسلا میں یہ تہذیبی اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ ایک جانب امریکہ کی اظہار یہ تہذیب ہے جس میں آپ آزادی اظہار کے ساتھ ساتھ آزادی عمل سے بھی لطف اٹھا سکتے ہیں۔ یہ اس ثقافت کا خاصہ بھی ہے۔ جس طرح جینی کی والدہ لیز بین ہے اور دوستوں کو ڈیٹ کرتی ہیں۔ یہاں اس ثقافتی رویے کو ناول نگار ہمارے ثقافتی رویے کے ساتھ الگ تناظر میں ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک جانب تو وہ امریکہ میں لیسبنازم تذکرہ کرتے ہیں تو دوسری جانب ہمارے سامنے ایک واقعہ ہے جو ثقافتی اقدار کے خلاف بھی ہے اور محبت کے عروج کی دلیل بھی ہے۔

جب عامر ایک ہجڑے سے محبت کرتا ہے اور شادی کرتا ہے اس صورت حال میں محبت ایک استعارے کی طرح بلند ہونا شروع ہوتی ہے۔ خواجہ سرا ہمارے معاشرے کا ایک حصہ ہیں لیکن یہ انتہائی نچلی سطح پر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں لیکن ان کے ہاں بڑا نظام پایا جاتا ہے۔ ان کی اپنی ایک کوڈ ورڈ پر مشتمل زبان ہوتی ہے رات کو لوگوں کے لیے سستی تفریح کا موقع دیتے ہیں ناچ گانا کرتے ہیں خوشی و غمی کے موقع پر پہنچ جاتے ہیں۔ گویا بے شک یہ کم تر سطح پر موجود ہیں لیکن ان کے ہاں زندگانی کا بھرپور نظام موجود ہے۔ عامر اپنی محبت حاصل کر لیتا ہے لیکن اس کا محبوب ایک بمب دھماکے میں اس سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح محبت کے استعارے سے یہ بات واضح کی گئی کہ یہ بمب حملوں جیسی ثقافتی تبدیلی نے کس قدر ہمیں اندر سے ہلا کر رکھ دیا ہے۔

اس کے علاوہ امریکہ اور پاکستانی طرز رہن سہن سے لے کر کھانے پینے تک کے تمام معاملات کو اس ناول میں موضوع بنایا گیا ہے۔ مشرقی اور مغربی اقدار و روایات میں بے پناہ فرق بلکہ بڑی حد تک تو تضاد پایا جاتا ہے۔ اور یہ تضاد صرف جغرافیائی نہیں ہے۔ بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی پے اس کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اسی تضاد نے دو مختلف تہذیبوں کو جنم دیا جن کی شناخت بالکل مختلف ہے اور ایک دوسرے بہت گہرے اور نہ مٹنے والے اثرات مرتب کئے ہیں۔ اکثر مقامات پر اسی تضاد نے دونوں تہذیبوں کو ایک دوسرے کے مد مقابل لا کھڑا کیا ہے اور آج دونوں تہذیبیں اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے تشخص اور بقا کی جنگ لڑ رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں مشرق کو مغرب سے خطرہ، مغرب کو مشرق سے خطرہ جیسے عناصر دیکھنے سننے کو ملتے ہیں اور اسی کشمکش کو اس ناول میں بیان کیا گیا ہے۔

کتابیات

کتابیات

آغا،وزیر۔کلچر کے خدوخال ۔لاہور: مجلس ترقی ادب،۲۰۰۹ء۔

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری، جلد دوم، لندن: آکسفورڈ کلیر بنڈن پریس لندن، ۱۴۸۲ء۔

اختر، سلیم۔کلچر ادب ۔لاہور: مکتبہ عالیہ، س ن۔

اختر، سلیم۔داستان اور ناول :تنقیدی مطالعہ ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء۔

اشرف خالد۔برصغیر میں اردو ناول۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۴ء۔

اقبال، علامہ۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ۔مترجم نذیر نیازی، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۳ء۔

انجم، نوشی۔سوال یہ ہے ؟۔ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۴ء۔

انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز۔جلد دوم، نیویارک: میکملن، ۱۹۵۹ء۔

ایلیٹ۔ٹی۔ایس۔نوٹس ٹووارڈس دی ڈیفینیشن آف کلچر۔فیبر اینڈ فیبر، ۱۹۲۷ء۔

بٹ، محمد افضال۔اردو ناول میں سماجی شعور۔اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء۔

برٹ، ایڈون اے۔فلسفہ مذہب۔مترجم بشیر احمد ڈار، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء۔

برق، غلام جیلانی۔ہماری عظیم تہذیب۔لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۱ء۔

جالبی، جمیل۔پاکستانی کلچر۔اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن، ۱۹۸۵ء۔

جاوید، قاضی۔تاریخ و تہذیب۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۰ء۔

جلال پوری، علی عباس۔تاریخ کا نیا موڑ۔جہلم: فرد افروز پبلشرز، ۱۹۸۷ء۔

حجتہ اللہ البالغہ۔جلد اول، لاہور: قومی کتب خانہ، س ن۔

حسن، سبط۔پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء۔کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۷ء۔

حسین، سید عابد۔ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب (جلد اول)۔دہلی: مکتبہ جامعہ دیال پریس، ۱۹۴۶ء۔

حسین، عابد۔قومی تہذیب کا مسئلہ۔علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء۔

حمید احمد خان، پروفیسر۔تعلیم و تہذیب۔لاہور: مجلس ترقی ادب کلب، ۲۰۰۲ء۔

درویش، صلاح الدین،تیسری دنیا کا فلسفہ انکار، لاہور: تخلیقات پبلشرز، ۲۰۰۱ء۔

دستی، شیراز۔ ساسا ۔لاہور: عکس پبلیکشنز،۲۰۱۸ء۔
رضوی، شعیب۔اسلامی ثقافت۔لکھنؤ: النور پبلیکشنز، ۱۹۶۷ء۔
سپرو، ہیری۔ثقافت کا مسئلہ۔سید قاسم محمود (مترجم) لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۴ء۔
سرسید۔مقالات سر سید۔جلد چہارم، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۶ء۔
سعید، ایڈورڈ۔ثقافت اور سامراج۔یاسر جواد (مترجم)۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹ء۔
سلیم، احمد (مرتب)۔فیض لوک ورثہ اور تہذیب و ثقافت کے مسائل۔لاہور: سنگ مائل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔
سلیم اختر، ڈاکٹر۔ادب اور کلچر۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء۔
سہیل، احمد، کیا سیموئل پی ہنٹگنٹن کا تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ ایک سازشی ٹوپی ڈرامہ ہے ؟
صافی، سلیم۔ متبادل بیانیہ۔اسلام آباد: IRD بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ۲۰۱۹ء۔
صلاح الدین، محمد۔ بنیادی حقوق ۔لاہور: ادارہ ترجمان القران، ۱۹۷۸ء۔
علی، نواز (مرتب)۔پاکستان میں اردو ناول کے پچاس سال۔لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۲ء۔
علی ندوی، سید ابوالحسن۔اسلامی تہذیب و ثقافت۔اسلام آباد: دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء۔
قاسم، غفور شاہ۔پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء سے تا حال۔لاہور: بک ٹاک، ۱۹۹۵ء۔
قاسم یعقوب، مدیر۔ماہنامہ نقاط ۔(شمارہ اگست ۲۰۰۷ء)۔
کامل قریشی، ڈاکٹر۔ اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب (مرتبہ)۔دہلی، اردو اکادمی، ۲۰۱۴ء۔
لامانوسکی، برونس۔اے سائنٹیفک تھیوری آف کلچر۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۵۸ء۔
لی کاک، اسٹیفن۔علم سیاست۔ترجمہ قاضی تلمذ حسین، دکن: جامعہ عثمانیہ، ۱۹۳۳ء۔
محمد خالد ندیم، پروفیسر نعیم۔جنوبی ایشیا میں مسلم تہذیب و فکر کا مطالعہ (مؤلفہ)۔لاہور: عبداللہ برادرز سن ندارد
معین الدین، عقیل۔مسلم ہندوستان ادب، تاریخ و تہذیب۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء۔
ہنٹنگٹن، سیموئل پی۔تہذیبوں کا تصادم ۔ترجمہ محمد احسن بٹ، لاہور: مثال پبلشرز، ۲۰۰۳ء۔

CE...
L... ...A...
ISL...